اِنتخابِ جدید

نظم

ایم - ایچ - ایس - جلال الدین احمد جعفری

انتخاب جدید

نظم

نویں دسویں درجوں کے لئے

مؤلفہ

جناب مولانا حافظ سید جلال الدین احمد جعفری
سابق ہیڈ مولوی گورنمنٹ کالج الہ آباد

پبلشر
جعفری برادرس

مطبوعہ انوار احمدی پریس-الہ آباد
قیمت ۸ر

پیش لفظ

انتخاب جدید کے نثر اور نظم کے دو حصے نویں اور دسویں درجوں کے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے منتخب کر کے پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ درجے ذرا اونچے ہوتے ہیں جن میں اس کا موقع رہتا ہے کہ طالب علموں اور طالبات کی ادبی صلاحیت نکھرے اور اُن میں صحیح مذاق ادب پیدا ہو اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے مایہ ناز شاعروں اور ادیبوں کے کلام مضامین اور طرز نگارش سے ان کی اچھی خاصی واقفیت کرا دی جائے۔

یہ انتخاب ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد پیش کیا جا رہا ہے اسلئے اس میں ان شاعروں اور ادیبوں کی بھی نظمیں اور مضامین ہیں جنھیں آزادی سے پہلے سیاسی مصلحت کی بنا پر اسکول کی کتابوں میں کوئی جگہ نہیں دیجاتی تھی۔ اس میں ایسی کوئی نظم یا مضمون نہیں ہے جو ہندوستانی قومیت کے منافی ہو بلکہ بہت سے مضامین اور نظمیں ایسی ہیں جن میں حب الوطنی جوش قومی۔ اتحاد و یگانگت کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ لڑکیوں کے مذاق ادب کی بھی آسودگی ہو چنانچہ صنف نازک سے متعلق مضامین اور نظمیں خاص طور سے شامل کی گئی ہیں ہر صنف سخن پر تنقیدی نوٹ ہے جو طالب علموں کی ضرورت اور

صلاحیت کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں اور جن میں کافی وضاحت و تفصیل پائی جاتی ہے اس مجموعے میں بہت سی نظمیں اور مضامین ایسے ہیں جو ان سے پہلے کورس کی کتابوں میں نہ تھے۔ نئے اور پرانے دونوں طرح کے ادب کی جھلکیاں ملیں گی۔ اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں وہی نظمیں اور مضامین ہیں جن سے شاعر یا ادیب کے طرز نگاش کی امتیازی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔

کتاب کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر اس کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں پر ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب کے دل کی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کی جائے اور نکتہ چینی سے زیادہ ہمدردی سے پڑھا اور پڑھایا جائے تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے

جلال الدین احمد جعفری

فہرست

نمبر	نام شاعر	صفحہ
۱	غزل تنقیدی نوٹ مؤلف	۵
۲	غزلیات .... خواجہ میر درد	۸
۳	؍؍ .... مرزا محمد رفیع سوداؔ	۱۰
۴	؍؍ .... میر تقی میرؔ	۱۲
۵	؍؍ .... خواجہ حیدر علی آتشؔ	۱۴
۶	؍؍ .... شیخ امام بخش ناسخؔ	۱۶
۷	؍؍ .... شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ	۱۸
۸	؍؍ .... حکیم مومن خاں مومنؔ	۲۰
۹	؍؍ .... مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ	۲۲
۱۰	؍؍ .... مولانا الطاف حسین حالیؔ	۲۵
۱۱	؍؍ .... امیر احمد امیرؔ مینائی	۲۷
۱۲	؍؍ .... نواب مرزا خاں داغؔ	۲۹
۱۳	؍؍ .... سید اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی	۳۱
۱۴	؍؍ .... سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی	۳۳
۱۵	؍؍ .... حسرتؔ موہانی	۳۵
۱۶	؍؍ .... فانیؔ بدایونی	۳۷
۱۷	؍؍ .... جگرؔ مرادآبادی	۳۹

نمبر	نام شاعر	صفحہ
۱۸	غزل .... چکبست لکھنوی	۴۱
۱۹	″ .... ضامن الہ آبادی	۴۳
۲۰	رباعی ... تنقیدی نوٹ ... مؤلف	۴۵
۲۱	رباعیات .... میرانیس	۴۶
۲۲	″ .... مرزا دبیر	۴۸
۲۳	″ .... حالی	۴۹
۲۴	″ .... اکبر الہ آبادی	۵۰
۲۵	″ .... مرزا یگانہ	۵۱
۲۶	قطعہ ... تنقیدی نوٹ ... مؤلف	۵۳
۲۷	قطعہ .... ذوق	۵۴
۲۸	″ .... مومن	۵۵
۲۹	″ .... غالب	۵۶
۳۰	″ .... حالی	۵۸
۳۱	″ .... شبلی	۶۰
۳۲	قصیدہ تنقیدی نوٹ مؤلف	۶۲
۳۳	قصیدہ .... سودا	۶۵
۳۴	″ .... ذوق	۶۷
۳۵	″ .... غالب	۶۸
۳۶	″ .... منیر	۷۱

نمبر		نام شاعر	صفحہ
۳۷	مثنوی تنقیدی نوٹ	مؤلف	۷۳
۳۸	مثنوی (انتخاب رموز العارفین)	میر حسن	۷۵
۳۹	〃 (انتخاب گلزار نسیم)	نسیم	۷۷
۴۰	〃 حب وطن	آزاد	۸۱
۴۱	〃 برکھا رت	حالی	۸۴
۴۲	مرثیہ تنقیدی نوٹ	مؤلف	۸۶
۴۳	مرثیہ	میر انیس	۸۹
۴۴	〃	مرزا دبیر	۹۸
۴۵	〃 مرثیہ غالب	حالی	۱۰۰
۴۶	نظمیات تنقیدی نوٹ	مؤلف	۱۰۳
۴۷	ہمالہ	اقبال	۱۰۴
۴۸	سراغ زندگی	〃	۱۰۶
۴۹	محبت	〃	۱۰۷
۵۰	نام پیدا کر	〃	۱۰۷
۵۱	فریاد قوم	چکبست	۱۰۸
۵۲	خاک ہند	〃	۱۱۱
۵۳	قوم کے سورماؤں کو الوداع	〃	۱۱۳
۵۴	مذہب شاعرانہ	〃	۱۱۶
۵۵	فغان دہلی	مولانا محمد علی جوہر	۱۱۷

نمبر		نام شاعر	صفحہ
۵۶	دعائے اسیر	مولانا محمد علی جوہر	۱۱۸
۵۷	عزم صحرا	تلوک چند محروم	۱۲۰
۵۸	نورجہاں کا مزار	"	۱۲۳
۵۹	اچھوتوں سے نفرت	برق دہلوی	۱۲۵
۶۰	وطن	جوش ملیح آبادی	۱۲۷
۶۱	جذبات فطرت	"	۱۲۹
۶۲	منہ اندھیرے	"	۱۳۵
۶۳	موسم بہار کا آخری گلاب	سرور جہان آبادی	۱۳۶
۶۴	الہ آباد	صفی لکھنوی	۱۳۸
۶۵	آرزو	ضامن الہ آبادی	۱۳۹
۶۶	تذکرے اور تبصرے	مؤلف	۱۴۱

حامداً و مصلیاً

غزل

غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے پیار اور محبت کی باتیں کرنا لیکن اصطلاح شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں عشق و محبت کی واردات موزوں ہوئی ہو۔ ابتدا میں یہ صنف صرف عشقیہ جذبات کیلئے مخصوص تھی لیکن قدیم اساتذہ کی غزلوں میں ہر طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

اس میں پند و نصائح۔ فلسفہ حیات۔ سیاسی مسائل، سماجی اصلاح اور تفریحی و افادی مضامین موزون کئے جاتے ہیں۔ اس کے نام کی بابت ایک روایت اور مشہور ہے۔ عرب میں ایک شخص غزال تھا جو زیادہ تر حسن و عشق کے معاملات نظم کرتا تھا اس لئے اس صنف کا نام اُسی شاعر کے نام پر غزل مشہور ہو گیا۔

مجملاً غزل کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) غزلیں عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں (الف) غزل مسلسل۔ (ب) غزل غیر مسلسل۔

(الف) غزل مسلسل۔ اس میں ایک خیال کئی شعر میں تسلسل کے ساتھ نظم کیا جاتا ہے۔ ایک شعر کا تعلق دوسرے شعر سے قائم رہتا ہے اور یہ تسلسل اُسوقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ پورا خیال موزوں نہ ہو جائے قدیم زمانہ میں ایسی غزلیں

خال خال نظر آتی ہیں لیکن عہد حاضر میں بعض شعرا مثلاً اقبال۔ جوش اور حسرت کا رجحان طبع ایسی غزلوں کی طرف رہا ہے اور اب کافی تعداد میں ایسی غزلیں ملتی ہیں۔ لیکن مقبولیت کا درجہ ابھی نہیں ملا ہے۔

(ب) غزل غیر مسلسل۔ اِس میں ہر شعر الگ ہوتا ہے اور ایک خاص خیال اور جذبہ کا حامل ہوتا ہے۔ گویا ہر شعر ایک مختصر سی نظم ہوتا ہے جو اپنے معنی کے لئے کسی دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایسی غزلیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور عام طور پر شعرا ایسی ہی غزلیں موزوں کرتے ہیں۔ اس میں وہ نہیں کافی آزادی رہتی اور ایسی غزلیں عام طور پر زیادہ پسند بھی کی جاتی ہیں۔

(۲) غزل میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور اگر ردیف بھی ہے تو ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ ایک غزل میں کئی کئی مطلع نظم ہوجاتے ہیں بعض شعرا اپنا زورِ طبیعت دکھانے کے دھن میں پوری غزل مطلع ہی مطلع میں کہہ جاتے ہیں۔ ایسی غزل کو غزل ذو المطالع کہتے ہیں۔ مطلعوں کے بعد جو شعر ہوتا ہے اُسے حسن مطلع کہتے ہیں غزل کے آخری شعر کو جس میں شاعر کا تخلص بھی ہوتا ہے اُسے مقطع کہتے ہیں۔ مطلع کے علاوہ ہر شعر کا مصرع ثانی مطلع سے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ غزل کے سب سے اچھے شعر کو بیت الغزل یا شاہ بیت کہتے ہیں۔

(۳) غزل بہت مختصر سی نظم ہوتی ہے۔ پانچ شعر سے پچیس شعر تک ایک غزل میں موزوں ہوتے ہیں لیکن کوئی قید نہیں ہے۔ اسی طرح سے بحروں کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ مروجہ بحروں میں سے جس بحر میں جی چاہے غزل موزوں کی جاسکتی ہے۔

(۴) غزل سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز نظم ہے اس کا تعلق کسی خاص طبقہ یا مذہب سے نہیں۔ ہر محفل اور ہر جلسہ میں شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہے اور بہت سے شعر حافظہ میں محفوظ ہو جاتے ہیں جو بہت سے موقعوں پر بیساختہ زبان پر جاری ہو جاتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں۔ اِس عام پسندی کی وجہ سے جتنے اشعار غزل میں کہے گئے ہیں کسی اور صنف سخن میں اُتنے اشعار نہیں کہے گئے ہیں۔

(۵) غزل سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مشکل نظم ہے آسان اس لئے کہ ہر شخص طبع آزمائی کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور مشکل اس لئے کہ اچھی غزل کہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے استادوں کی ہر غزل اچھی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔

طرز بیان اس کا سیدھا سادہ ہونا چاہئے الفاظ شیریں اور مترنم ہوں تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جن شعرا نے دقّت نظر اور مشکل پسندی سے کام لیا ہے۔ اُنہیں ہر دل عزیزی حاصل نہیں ہے۔

عشقیہ جذبات و احساسات بڑے نازک۔ لطیف اور حسین ہوتے ہیں ان کا پیرایہ بیان بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔

خواجہ میر درد

(۱)

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصہ مختصر دیکھا

---

(۲)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا — پر اُسے آہ نے اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

---

(۳)

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یا ربّ یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اُٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

اطفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مست شراب عشق وہ بیخود ہے جس کو حشر
اے درد چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

---

(۴)

پہلو میں دل تپاں نہیں ہے
ہر چند کہ یاں ہے یاں نہیں ہے

عالم ہو قدیم خواہ حادث
جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے

ڈھونڈھے ہے تجھے تمام عالم
ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے

عنقا کی طرح میں کیا بتاؤں
جز نام مرا نشاں نہیں ہے

جوں شمع نہ راز دل کہوں گا
ایسی بھی مری زباں نہیں ہے

فریاد کہ درد جب تلک میں
تیار ہوں کارواں نہیں ہے

مرزا محمد رفیع سودا

(۱)

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا — پانی بھی گر پئیں تو مزا ہی شراب کا
دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر — لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
تھا کس کے دل کو کشمکش عشق کا دماغ — یارب بُرا ہو دیدۂ خانہ خراب کا
قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے — دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

---

(۲)

اب تلک اشک کا طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا — تجھ سے اے دیدۂ گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا
جس نے دیکھا ترا مکھڑا کہا سبحان اللہ — قدرت حق سے نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا
خون دل چشم سے بہتا تھا مری دامن تک — موج زن تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
قابل شانہ ہوئی زلف تری جس دن سے — کبھی جو دل کہ پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ابر مژگاں کے تصدق سے ترے ای سودا
سبز و خرم جو بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا

---

(۳)

جاتے ہیں لوگ قافلہ کے پیش و پس چلے — دنیا عجب سرا ہے جہاں آکے بس چلے

کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے
اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ جمعیت دلی یہ ترے پھول ہنس چلے
تیرے سخن کو میں بسر و چشم ناصحا مانوں ہزار بار اگر دل سے بس چلے

کام اُس گلی میں سر سے یہ سوؔدا گزر چکا
کیا تاب اک قدم جو اُدھر بوالہوس چلے

---

(۴)

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں
یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں
غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
حباب لب جو ہیں اے باغباں ہم چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سوؔدا
اُسے تیرے کوچہ میں کم دیکھتے ہیں

میر تقی میر

(۱)

راہ دور عشق سے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرت یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اوسکو رائگاں کھوتا ہے کیا

---

(۲)

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — پر سخن تا بہ لب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق میں یہ ادب نہیں آتا

---

(۳)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — دل کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک — قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ — اس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا — تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی — ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

---

(۴)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشم دل کھول اُس بھی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اوسی خانہ خراب کی سی ہے
دیکھیے ابر کی طرح اب کی — میری چشم پرآب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

خواجہ حیدر علی آتش

(۱)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ۔۔۔ کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا
زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف ۔۔۔ قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
اُڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر ۔۔۔ مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا
چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر ۔۔۔ دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا
طبل و علم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ۔۔۔ ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو ۔۔۔ دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

---

(۲)

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا ۔۔۔ ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
وہ شوخ نہاں گنج کی مانند ہے اُس میں ۔۔۔ معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی ۔۔۔ جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا
آوارگی نکہت گل سے ہے اشارہ ۔۔۔ جامہ سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا

یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا

---

(۳)

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

---

(۴)

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہونچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریئے

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریئے

شیخ امام بخش ناسخ

(۱)

کافی بس اس کو نشہ ہے بوے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا

ہر ہر قدم پہ پھوٹتے جاتے ہیں آبلے
نقش قدم میں طور ہے چشم پُر آب کا

ہر صبح وو ہی صبح ہے ہر شام وو ہی شام
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا

آتی ہے خشک و تر سے مجھے بوئے زلف یار
ہے مشک کی زمین تو دریا گلاب کا

مشکل بغیر ساقی مہ وش ہے دور مے
محتاج آفتاب ہوا ماہتاب کا

اپنی غزل پہ آپ میں لکھتا ہوں اب غزل
دیکھو جواب ہے سخن لاجواب کا

---

(۲)

جب سے کہ بتوں سے آشنا ہوں
بیگانہ خدائی سے ہوا ہوں

کیوں کر کہوں عارف خدا ہوں
آگاہ نہیں کہ آپ کیا ہوں

بیگانہ ہوں کیونکر آشنا سے
بیگانوں سے میں آشنا ہوں

منہ اُن کے نہیں ہے شکر ورنہ
ہر بت کہتا کہ میں خدا ہوں

کرتے ہیں گریز مجھ سے منحوس
بے شبہ میں سایہ ہما ہوں

ناسخ کی یہ التجا ہے یارب
مر جاؤں تو خاک کربلا ہوں

(۳)

رفعت کبھی کسی کی گوارہ یہاں نہیں — جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دور روز ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں — وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

عبرت کی جا ہے لاکھوں ہی طفل و جواں نہیں — پیری میں بھی خیال اجل کا یہاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب — یاں اعتماد دوستی جسم و جاں نہیں

آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گرد راہ — حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہیں

حاصل تجھے بصارت یعقوب ہو اگر — یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی — تنہا برائے لذت دنیا زباں نہیں

جن کے سروں پہ آپ مگس راں رہا ہما — اُن کا لحد میں آج کوئی استخواں نہیں

دھوکا نہ کھا ظروف وضو کو تو دیکھ کر
مسجد میں مے فروش کی ناسخ دکاں نہیں

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

(۱)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگ دنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
سُراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈھا نہ پایا
وہ بولے دیکھکر تصویر یوسف — سنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا

نظیر اُس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

---

(۲)

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا — ہے حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا
جو چشم کہ بے غم ہو وہ ہو کور تو بہتر — جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا — لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
تاثیر محبت عجب اک حب کا عمل ہے — لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا
دل گر کے نظر سے تری اُٹھنے کا نہیں پھر — یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

ق

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے یہاں سے
دل اس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

---

(۳)

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے ابھی آنے میں اُن کے
اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا

تا صاف کرے دل نہ مئے صاف سے صوفی
کچھ سود و صفا علم تصوف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خط غیر مرا واں کسی عنواں
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گزرے نہ دل میں ترے کافر
یاد اس لئے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

حکیم مومن خاں مومن

(۱)

اثر اس کا ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
ایک دشمن کہ چرخ ہی نہ رہے — تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
آہ طول امل ہے روز افزوں — گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

---

(۲)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو — وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم — گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

---

(۳)

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے — کہوں کچھ اور نکلے کچھ زباں سے

قیامت مرتے دم آئی فغاں سے — جہاں لیکر چلے ہیں ہم جہاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

گر اپنے وہم ہی سے اس نے پوچھا — مرا احوال میرے رازداں سے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں — زیادہ بدگماں اس بدگماں سے

برا ہے عشق کا انجام یارب — بچانا فتنۂ آخر زماں سے

خدا کی بے نیازی ہائے مومنؔ
ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے،
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ بیان تیرا غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

---

(۲)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش　کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

---

(۳)

کوئی اُمید بر نہیں آتی　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　پر طبیعت اُدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

---

(۴)

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

(۱)

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں
جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا

راجوں سے راج چھینے شاہوں سے تاج چھینے
گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا

کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقوٰے
جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا

فرہاد کوہ کن کی لی تو نے جان شیریں
اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا

یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری
یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا

افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

اِک دسترس سے تیری حاؔلی بچا ہوا تھا
اس کے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

---

(۲)

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
"دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت"

جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری
ہیں فدائی کم - تماشائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلےٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

---

(۳)

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

عہد گیتی پر نہ پھر بس کامراں
آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ

علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ

پاکبازوں کو نہیں کچھ قید وضع
جو ہیں اچھے اُن پہ سب کھلتے ہیں رنگ

وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ

بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت
ہو گی ایجاد اب نئی توپ و تفنگ

قوم کو حالیؔ نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

امیر احمد امیرؔ مینائی

(۱)

عمر برق و شرار ہے دنیا
کتنی بے اعتبار ہے دنیا

داغ سے کوئی دل نہیں خالی
کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا

ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع
عرصۂ کارزار ہے دنیا

نشۂ عیش یاں نصیب کسے
کہ سراپا خمار ہے دنیا

آنے جانے پہ سانس کی ہے مدار
سخت ناپائدار ہے دنیا

اپنے مستوں سے بھاگتی ہے مدام
کس قدر ہوشیار ہے دنیا

ایک جھونکے میں ہے اِدھر سے اُدھر
چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیرؔ
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

---

(۲)

جب ہوا وعدہ اور وفا نہ ہوا
ہوگیا ایک سب ہوا نہ ہوا

ہائے بیدرد کیا مزا ہوتا
تیرے پہلو میں دل مرا نہ ہوا

دھوم تھی اُن کی لن ترانی کی
کیا کہیں ہم سے سامنا نہ ہوا

کیوں نہ منصور دار پر کھنچتا
رازداری کا حق ادا نہ ہوا

آئینہ دل کا بے مثال رہا
کسی صورت سے آشنا نہ ہوا

شرم عصیاں سے جو بہا آنسو
اس کی رحمت کو اک بہانہ ہوا

صورتِ لالہ اس چمن میں امیرؔ
داغ دل سے مرے جدا نہ ہوا

(۳۱)

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا | کرتا نہ میں گنہ تو گناہ عظیم تھا
باتیں بھی کیں خدا نے دکھایا جمال بھی | اللہ کیا نصیب جناب کلیم تھا
دنیا کا حال اہل عدم ۔ ہے یہ مختصر | اک دو قدم کا کوچۂ اُمید و بیم تھا
کرتا میں دردمند طبیبوں سے کیا رجوع | جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا

جس دن تھا میں چمن میں ہوا خواہ گل امیرؔ
نام صبا کہیں نہ نشاں نسیم تھا

(۳۲)

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے | کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ | سو نشانوں پہ بے نشاں تو ہے
تو ہے خلوت میں اور جلوت میں | کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی | میزباں تو ہے میہماں تو ہے
جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی | جان کہتی ہے جانِ جاں تو ہے
نہ مکاں میں نہ لامکاں میں کچھ | جلوہ فرما یہاں وہاں تو ہے
رنگ تیرا چمن میں بو تیری | خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

محرم راز تو بہت ہیں امیرؔ
جس کو کہتے ہیں رازداں تو ہے

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

(۱)

وہ زمانہ نظر نہیں آتا — کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا
جان جاتی دکھائی دیتی ہے — اُن کا آنا نظر نہیں آتا
عشق در پردہ پھونکتا ہے آگ — یہ جلانا نظر نہیں آتا
دل نے اس بزم میں بٹھایا تو — اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا
تم ملاؤ گے خاک میں ہم کو — دل ملانا نظر نہیں آتا
غیر کے ساتھ دل میں بھی دیکھا — کبھی تنہا نظر نہیں آتا

ڈھونڈھتی ہیں جسے مری آنکھیں
وہ تماشا نظر نہیں آتا

---

(۲)

عذر اُن کی زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا
دل میں رہنے نہ دوں ترا شکوہ — دل میں آیا زبان سے نکلا
اک جہاں ہم نے دیکھ ڈالا ہے — تو نرالا جہان سے نکلا
وہم آتے ہی دیکھئے کیا ہو — وہ اکیلا مکان سے نکلا
اُسکو آیت حدیث کیا سمجھیں — جو تمہاری زبان سے نکلا
سمجھو پتھر کی تم لکیر اُسے — جو ہماری زبان سے نکلا

ہم کھڑے تم سے باتیں کرتے تھے
غیر کیوں درمیان سے نکلا

(۳)

دن گذارے عمر کے انسان ہنستے بولتے ‏ ‏ جان بھی نکلی تو میری جان ہنستے بولتے

مجھکو مجبوری نہ تھی اُس کو زبردستی نہ تھی ‏ ‏ لے گیا کافر مرا ایمان ہنستے بولتے

یہ تو اُن کی دل لگی ہے یہ تو اُن کی بات ہے ‏ ‏ وعدہ اُٹھتے بیٹھتے پیمان ہنستے بولتے

میں ہنسا بولا اگر تم سے تو کیوں برہم ہوئے ‏ ‏ کیا نہیں انسان سے انسان ہنستے بولتے

چپ کھڑی روتی ہے تو اے شمع محفل رات بھر ‏ ‏ کاش مشکل ہو تری آسان ہنستے بولتے

نکتہ چیں ہے غیر اسے دل اور وہ نازک مزاج ‏ ‏ ایسے موقع پر نہیں نادان ہنستے بولتے

انقلاب دہر سے باقی نہیں ایسا مقام ‏ ‏ چار مل کر اک جہاں انسان ہنستے بولتے

ہو رہے خاموش کیوں مجھکو تو یہ اُمید تھی ‏ ‏ دیکھ کر تم داغ کا دیوان ہنستے بولتے

---

(۴)

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اک عالم کی شیدائی تجھے ‏ ‏ لگ گئی کس کی نظر اے حسن زیبائی تجھے

تو مرے سر پر کھڑی رہتی ہے ہر دم اے اجل ‏ ‏ اور پھر سارا جہاں کہتا ہے ہرجائی تجھے

دھن لگی رہتی ہے اپنے دوست کی آٹھوں پہر ‏ ‏ میں غنیمت جانتا ہوں کنج تنہائی تجھے

جستجو جس کی ہے اپنے آپ میں تو دیکھ لے ‏ ‏ دیکھنے کو دی ہے اے غافل یہ بینائی تجھے

تیری دانائی کے قائل تھے سب افلاطوں منش

شاعری نے کر دیا اے داغ سودائی تجھے

اکبر الہ آبادی

(۱)

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہو کر — عنادل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہو کر

بچھا فرش زمرد اہتمام سبزۂ تر میں — چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہو کر

عروج نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں — ترانے گائے مرغان چمن نے شادماں ہو کر

بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم صبحگاہی نے — ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگین بتاں ہو کر

جوانان چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا — کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں — صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو — ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر

زبان برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں — خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانہ کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

---

(۲)

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں — یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

اُن کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں — دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں

بحر ہستی میں ہوں مثال حباب — مٹ ہی جاتا ہوں جب اُبھرتا ہوں

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے — سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں — میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

ت ترانی نہیں ہے مانع غش — میں ترے نام ہی پہ مرتا ہوں
پ کیا پوچھتے ہیں میرا مزاج — شکر اللہ کا ہے مرتا ہوں

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبرؔ
دل میں جو آئے کہہ گذرتا ہوں

---

(۳)

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے — اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے
دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا — بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے
چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں — اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجئے
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو — طول شب فراق کو تو ناپ دیجئے
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات — انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

اُس بت کے در پہ غیر سے اکبرؔ نے کہہ دیا
زر ہی میں دینے لایا ہوں جان آپ دیجئے

سید علی محمد شاد عظیم آبادی

(۱)

سنی کس نے ہے کون تیری سنے گا — نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا
زمانہ سے ہم تو گذر جائیں گے خود — زمانہ مگر آپ کو کیا کہے گا
ان آنکھوں پہ رکھئے نہ دامن اٹھا کر — یہ دریا ابھی مدتوں تک بہے گا
یوں ہی شام ہوگی یوں ہی صبح ہوگی — یہی رات دن کا تماشا رہے گا
جو کرنے کی باتیں ہیں اے دل وہی کر — زمانہ تجھے جو کہے گا کہے گا
فلک کے تلے دب کے رہ جائیں گے ہم — سروں پر یہ گنبد ضرور آ رہے گا

یہ دنیا ہے اے شاد ناحق نہ الجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

---

(۲)

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ — ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
نہیں اٹھتے قدم کیوں جانب دیر — کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم — میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
سویرا ہے بہت اے شور محشر — ابھی بیکار اٹھوایا گیا ہوں
ستایا آ کے پہروں آرزو نے — جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے — بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

---

(۳)

قدر ہنر تھی جن سے وہ اہل ہنر گئے — یہ دور اور ہے وہ زمانے گذر گئے
جنگل کو باغ باغ کو جو خلد کر گئے — کیوں اے صبا وہ پھول چمن سے گذر گئے
اس بزم میں کوئی نہوا باریاب حیف — نالے بھی جو گئے تھے وہ سب بے اثر گئے
خواہان ملک و زر نہیں سودائیان عشق — خوش ہیں کہ اب سروں سے وہ سب دردِ سر گئے
توبہ کی یاد آئی ہے اے شیخ کب مجھے — دو چار گھونٹ جبکہ گلے سے اتر گئے
جن جن سے اک خزانۂ قدرت ہے تہ زمیں — اے چرخ کس خرابہ میں وہ اہل زر گئے

تکلیف اٹھائی دل نے کہ آرام سے کٹی
ہر طرح شاد دونوں زمانے گذر گئے

حسرت موہانی

(۱)

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا
نصیب شوق رہا داغ ناتمامی کا

بچھی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں
کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا

کھلے نہ ہم سے خموشاں آرزو کی زباں
جو اتفاق بھی ہو اُن سے ہم کلامی کا

قصور مجھ پہ نہ ضائع کریں عطا اپنی
کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا

بقدر شوق کہاں تاب التماس ہمیں
لکھیں جواب جو اس نامہ گرامی کا

بہت ہے میرے لئے جور گاہ گاہ کی یاد
اُمیدوار نہیں التفات سامی کا

نہاں نہ ہو کرم یار میں ستم حسرت
بہت نہ کیجئے اظہار شادکامی کا

---

(۲)

صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار
دل وحشی ہے اور جنون بہار

کشمکش میں ہے کامرانی شوق
مجھ کو ابرام ہے انہیں انکار

دل مایوس میں ہے نقش اُمید
یا مسافر کوئی غریب دیار

ق

لطف کر لطف اے سراپا ناز
تجھ پہ رنگینی بہار نثار

دل عشاق ہیں اُمید کے جام
بادۂ اشتیاق کے سرشار

غیر ممکن ہے ہم سے طاقت غیر
اے جفاکار اے غریب آزار

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسم حسرت کی قید ہے بیکار

---

(۳)

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے ساقی جاں پرور کچھ لطف و عنایت بھی

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بادل جو نظر آئے بدلی مری نیت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

---

(۴)

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانہ رسم جفا
اور مجھے حاصل تھے لطف بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماس عذر و تمہید شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

فانی بدایونی

(١)

خوشی سے رنج کا بدلہ یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈھا اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے لیکن
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

بتا اے جرس اور میں کدھر جاؤں
نشانِ گردِ رہ کارواں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

مجھے عزیز سہی قدر دل تمہیں کیوں ہو
کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانیؔ
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

---

(٢)

بیگانۂ اختیار ہو جا
راضی بہ رضائے یار ہو جا

جینے کو یہ آسرا بہت ہے
اچھا ہے اُمیدوار ہو جا

غیرت ہے تو غم کی جستجو کر
ہمت ہو تو بیقرار ہو جا

اے دردیہ چٹکیاں کہاں تک　　اُٹھ اور جگر کے پار ہو جا

ماتم کدۂ وفا ہے عالم
فانیؔ دل سوگوار ہو جا

---

(۳)

کیا چھپائے کسی سے حال اپنا　　جی ہی جب ہو گیا نڈھال اپنا
ہم ہیں اُس کے خیال کی تصویر　　جس کی تصویر ہے خیال اپنا
وہ بھی اب غم کو غم سمجھتے ہیں　　دور پہنچا مگر ملال اپنا
تو نے رکھ لی گناہ گار کی شرم　　کام آیا نہ انفعال اپنا
دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے　　یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا
باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے　　لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا

موت بھی تو نہ مل سکی فانیؔ
کس سے پورا ہوا سوال اپنا

جگر مراد آبادی

(۱)

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
در حقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

ہائے کافر دل کی یہ کافر جنوں انگیزیاں
تم کو پیار آئے نہ آئے مجھ کو پیار آ ہی گیا

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

عشق کی یہ نمود بے یہم کیا
ہو تمہیں تم اگر تو پھر ہم کیا

جز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسم کیا

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا

ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ اضطراب پیہم کیا

موت کی نیند چھائی جاتی ہے
کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا

ہمہ تن عشق بر ملا بن جا
درد کی اک صدائے پیہم کیا

اس نظر میں نہیں سماتا کچھ
جان بیتاب و چشم پرنم کیا

عشق خاموش کے مزے میں جگر
جوشش فریاد و شور ماتم کیا

---

(۳)

آئے زباں پہ رازِ محبت محال ہے ۔۔۔ تم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے

دل تھا ترے خیال سے بہلا چمن چمن ۔۔۔ اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

کم بخت اس جنونِ محبت کو کیا کروں ۔۔۔ میرا خیال ہے نہ تمہارا خیال ہے

آنکھیں تو کھول سر تو اُٹھا دیکھ تو ذرا
کب سے جگر وہ چاند سا چہرہ نڈھال ہے

چکبست لکھنوی

(۱)

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کے لئے
بہار عالم فانی رہے رہے نہ رہے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی
یہ مشت خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زباں کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو
یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے

دلوں میں آگ لگے یہ وفا جوہر ہے
یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کیلئے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

---

(۲)

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

یہ بیکسی بھی عجب بیکسی ہے دنیا میں
کوئی ستائے ہمیں ہم ستا نہیں سکتے

کشش وفا کی انہیں کھینچ لائی آخر کار
یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں
مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

(۳)

ہم پوچھتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

آئے نہ تھے جس چمن سے وہ برباد ہو گیا
اب ہم قفس میں یاد کریں کیا بہار کو

منظور ہے کہ آمدِ گل کا پیام دیں
کلیاں بلا رہی ہیں نسیمِ بہار کو

یہ کہہ کے اُن کی بزم میں ہم بھی پہنچ گئے
کیا تھا جو آج یاد کیا خاکسار کو

خود ہی مٹا کے جوہرِ ایمان و آبرو
ہم کوستے ہیں گردشِ لیل و نہار کو

ہیں باغباں کے بھیس میں گل چیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو

ضامن الہ آبادی

(۱)

چار دن کی بھی یہ بہار نہیں ‏ ‏ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

سچ ہے دل کو ہیں اختیار تمام ‏ ‏ دل پہ لیکن کچھ اختیار نہیں

ہم بھی اس بزم ناز میں جاتے ‏ ‏ کیا کہیں دل کا اعتبار نہیں

عشق ہی وہ مرض ہے دنیا میں ‏ ‏ جس کا بڑھنا بھی ناگوار نہیں

کتنی دلکش ہے منزل ہستی ‏ ‏ مگر افسوس پائیدار نہیں

جھوٹ بھی تم کہو تو سچ ٹھہرے ‏ ‏ میرے سچ کا بھی اعتبار نہیں

ان گناہوں پہ یہ کرم اس کا
پھر بھی انسان شرمسار نہیں

---

(۲)

دیکھو تاثیر جذب کامل کی ‏ ‏ اپنے دل سے سنو مرے دل کی

ہم سناتے کچھ اور افسانے ‏ ‏ ختم ہوتی جو داستاں دل کی

جان جائے تو کچھ نہیں پرواہ ‏ ‏ بات جائے نہ عشق میں دل کی

خضر بھی راہ پر لگا نہ سکے ‏ ‏ ایسا بھولا ہوں راہ منزل کی

جستجو اس کی جو بغل میں ہے ‏ ‏ سادگی دیکھئے مرے دل کی

مٹنے پر بھی ہے یہ اثر ضامن
ہر زباں پر ہے داستاں دل کی

(۳)

دل سے بہتر کوئی خلوت گہہ پر نور نہیں
اس کا یا سنگ تجلی کدۂ طور نہیں

سجدے کرتا ہوں سزا وار سمجھ کر تجھکو
خواہش خلد نہیں آرزو و حور نہیں

چشم ظاہر سے تو خلوت میں بھی پردہ ہے ایسا
چشم باطن سے سر بزم بھی مستور نہیں

ہوش کہتا ہی کہ ہے منزل عرفان ابھی دور
بے خودی کا ہے اشارہ کہ نہیں دور نہیں

ٹوٹے جب تک کہ نہ دل ہو نہ اثر سے ہم رنگ
یہ وہ شیشہ ہے کہ بیکار ہے گر چور نہیں

دیکھو جرأت کہ یہ انسان ضعیف البنیاں
ہو کے مجبور سمجھتا ہے کہ مجبور نہیں

جان جائے کہ رہے کچھ نہیں پروا ضامنؔ
خار غم دل سے نکل جائے یہ منظور نہیں

رباعی

رباعی نظم کی ایک قسم ہے جس میں چار مصرعے یعنی دو شعر ہوتے ہیں اس لئے بعض حضرات اسے دوبیتی بھی کہتے ہیں۔ اس کا ایک دوسرا نام 'ترانہ' ہے۔ ہندی میں چوپائی اسی قسم کی چیز ہے لیکن نوعیت اس کی جداگانہ ہے۔ ان چار مصرعوں میں شاعر صرف ایک خیال نظم کرتا ہے۔ گویا ان دو شعروں میں بھی تسلسل قائم رہتا ہے عموماً رباعی کا حسن چوتھے مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر یہ اچھا ہوتا ہے تو رباعی اچھی سمجھی جاتی ہے۔ رباعی کیلئے چوبیس بحریں مخصوص ہیں کہ اگر ان میں موزوں ہوتی ہے تو رباعی کہلاتی ہے ورنہ قطعہ۔ اس کا بنیادی وزن "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" ہے۔ ہر رباعی قطعہ ضرور ہوتی ہے اس لئے کہ دونوں شعر میں مضمون کے اعتبار سے ربط ہوتا ہے۔ لیکن ہر قطعہ جو دو شعروں کا ہو وہ رباعی نہیں کہلاتا۔ اس لئے کہ وہ مخصوص بحروں میں موزوں نہیں ہوتا۔ ایک فرق اور ہے وہ یہ کہ قطعہ میں پہلے شعر کا مطلع ہونا لازمی نہیں ہوتا لیکن رباعی کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ، ہم ردیف اور ہم وزن ہوتے ہیں اور چوتھا مصرع ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ بعض لوگ تیسرے مصرعہ میں بھی ردیف اور قافیہ کی پابندی جائز سمجھتے ہیں۔

رباعی میں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اور قطعہ میں چار مصرع بھی ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ بھی۔ مضمون کے اعتبار سے رباعی میں ہر طرح کے خیالات نظم ہوتے ہیں لیکن قدیم شعرا خاص طور پر اخلاقی مسائل موزوں کیا کرتے تھے بعض شعرا مثلاً جرأت نے عاشقانہ رباعیاں کہی ہیں۔ عہد حاضر میں اسکی کوئی قید نہیں ہے۔

رباعیات

میر انیس

(۱)

انجام بخیر ابتدا بگڑی ہے — گھر گر نہ پڑے کہیں بنا بگڑی ہے
کشتی سے انیس ہم کنارہ ہو جائیں — الٹا دریا بہا ہوا بگڑی ہے

---

(۲)

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے — مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مراد — سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

---

(۳)

انسان ذی عقل و ہوش ہو جاتا ہے — اور صاحب چشم و گوش ہو جاتا ہے
گر جان نہیں سخن تو بتلائیے پھر — کیوں مر کے بشر خموش ہو جاتا ہے

---

(۴)

انسان ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں — سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں
اندیشۂ آشیاں و خوفِ صیاد — مرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

---

(۵)

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اُٹھو اُٹھو یہ خواب غفلت کب تک
دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

---

(۶)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

---

(۷)

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

مرزا دبیر

(۱)

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے — عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب — جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

---

(۲)

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا — قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

---

(۳)

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے — قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے تصنع بے سود — عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

---

(۴)

پیش امرا طالب زر جھکتے ہیں — سجدے کی طرح مجری کو سر جھکتے ہیں
سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح — ہے مال سوا جدھر اُدھر جھکتے ہیں

حالی

(۱)

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو	روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا	ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

---

(۲)

بزم میں آفریں کے لائق ہونا	شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا
سن نہیں جب تک دل میں ہے نفاق	آساں نہیں مقبول خلائق ہونا

---

(۳)

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے	ہر قہقہہ پیغام بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں	کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

---

(۴)

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا	مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے	جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

(۵)

ٹی سے ہوا سے آتش و آب سے یاں	کیا کیا نہ ہوئے بشر سے اسرار عیاں
رے خزانے ہیں ازل سے اب تک	گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں

اکبر الہ آبادی

(۱)

کیا تم سے کہیں جہان کو کیسا پایا — غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن — کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

(۲)

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش — ذلت ہے دراصل جاہ و دولت کی تلاش
اکبرؔ تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈھ — محنت ہی میں کر سکون و راحت کی تلاش

(۳)

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

(۴)

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ — اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

(۵)

خواہش ہے تجھے اگر غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے بندے — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

مرزا یگانہ لکھنوی

(۱)

ساجن کو سکھی منالو۔ پھر سو لینا — سوئی قسمت جگالو۔ پھر سو لینا
سوتا سنسار، سننے والا بیدار — اپنی بیتی سنالو۔ پھر سو لینا

---

(۲)

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا — سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے — جھونکا کھا کے سنبھلتے رہنے کے سوا

---

(۳)

اللہ یہ زندگی بھی ہے قابل دید — اک طرفہ طلسم دید جس کی نہ شنید
منزل کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں — پیچھے تو اجل ہے آگے آگے امید

---

(۴)

اے ہمت مردانہ دکھا دے وہ کمال — کہتے ہیں جسے جہاد نفس اہل کمال
بہتر ہے دیو کو پکڑ لے زندہ — قابو میں کرلے نفس کو مار نہ ڈال

---

(۵)

آرام سے سوتا ہے کوئی کمل میں — منگل کوئی گاتا ہے پڑا جنگل میں
میں ماہی بے آب مجھے چین کہاں — اک موج پریشاں ہوں عجب ہلچل میں

(۶)

آئینۂ حق ہوں خود پسندی کیسی　　دیوانہ ہوں اپنا ہوشمندی کیسی
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں　　پستی کسے کہتے ہیں بلندی کیسی

---

(۷)

رہنے کا نہیں بند در آزادی　　دیتی ہیں ہوائیں خبر آزادی
دروازۂ زنداں درِ توبہ تو نہیں　　ہاں المدد اے دردِ سر آزادی

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ شعرا کی اصطلاح میں قطعہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک خیال یا ایک واقعہ دو شعروں میں یا اُس سے زیادہ اشعار میں موزوں کیا گیا ہو۔ گویا بیان میں تسلسل و ربط پایا جاتا ہو۔ برخلاف غزل کے پہلا شعر مطلع نہیں ہوتا لیکن بعض شعرا نے اسکی پابندی نہیں کی ہے اور مطلع بھی کہا ہے۔ باقی ہر شعر کے مصرعہ ثانی میں پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے قافئے اور ردیف کی پابندی ہوتی ہے۔ مضامین زیادہ تر اخلاقی۔ تاریخی اور اصلاحی ہوا کرتے ہیں۔ قطعہ کے لئے کوئی خاص وزن مقرر نہیں ہے۔ شاعروں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس وزن میں چاہیں قطعہ موزوں کریں۔ پہلے زیادہ تر غزلوں میں قطعات موزوں ہوتے تھے لیکن اب ان کے علاوہ بھی قطعات نظم ہوتے ہیں اور اب ایک مستقل صنف ہی قطعات کی ہوگئی ہے۔

ذوقؔ

قطعہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے — قصد صید افگنی کیا جس دم
خون نخچیر سے ہوا سارا — دامن دشت لالہ زار ارم
نہ بچا اُس شکار افگن سے — صید کوئی سوائے صید حرم
مُرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ — ہوئے مسکن پذیر دشت عدم
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ — ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
سمجھے شیر آپ کو ہزار غنیم — اُس کے پر سامنے ہے مثل غنم
شیر گردوں بھی اُسکے لشکر میں — پائے ہرگز نہ قدر شیر علم
رہے مانند شیر قالیں کے — اوج ہمت سے اُسکے زیر قدم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے — ہمسر اژدہائے آتش دم
کئے شیر ژیان شکار کئے — اُس غضنفر شکار نے پیہم
ہے بجا گر دلاوران جہاں — کھائیں اُسکی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو — چاہا اس طرح دل نے کیجے رقم
تا رہے یادگار عالم میں — وصف عالی صاحب عالم

لکھی اے ذوقؔ میں نے یہ توصیف
مع تاریخ ثانیٔ رستم

۱۲۶۲ ہجری

مومنؔ

تذکرہ گلشن بیخار

کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا | ہے شیفتہ جس کے جان معنی
یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا | کوئی نہیں قدر دانِ معنی
افکار بلند سے بنایا | نہ چرخ پر آسمانِ معنی
ہر فقرۂ نثر جان معنی | ہر شعر رواں روانِ معنی
کیا بات ہے منتخب کی تیری | اے منتخب جہانِ معنی
ہر نقطۂ انتخاب تیرا | خال رخ دلبرانِ معنی
تیرے جو سخن سے ہے سرافراز | الفاظ کا پایہ شانِ معنی
معنی ہیں نشاط از الفاظ | الفاظ ہیں مدح خوانِ معنی
ہے تذکرہ یا ریاضِ فردوس | فردوس ہے یا جنانِ معنی
اے تازہ بہار باغِ مضموں | اے گلشن بےخزانِ معنی
آیا ہے خیال سال اتمام | تھا وہ بھی تو باغبانِ معنی
غنچہ کی طرح سے سر فرو تھا | یک چند وہ ہم زبانِ معنی
جب نغمہ سرا نہو سکا وہ | داستان زن داستانِ معنی

ہاتف نے کہا ہے اس کی تاریخ
گلدستہ گلستان معنی

۱۲۵۰ ہجری

غالب

گذارش بحضور شاہ

اے شہنشاہ آسماں اورنگ — اے جہاندار آفتاب آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمئی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ و بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کارگزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر — نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں — مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں — ذوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال — کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ — بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی   وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ

میری تنخواہ جو مقرر ہے   اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک   خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات   اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض   اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا   ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں   شاعر نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان اگر سنئے   ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے   ہے قلم میرا ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد   قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا   آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ   تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام   شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مولانا حالیؔ

دلیؔ کی شاعری کا تنزل

اک دوست نے حالیؔ کے کہا از رہِ انصاف
کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُس کے سخن کو

چند اہلِ زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو

شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو

معلوم ہے حالیؔ کا جو ہے مولد و منشا
اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو

اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلیؔ کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اُس سے نہ پورب نہ دکن کو

بلبل ہی کو معلوم ہیں اندازِ چمن کے
کیا عالمِ گلشن کی خبر زاغ و زغن کو

حالیؔ کی زباں گر بہ مثل شہد لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجئے کیا ایسے لبن کو

ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہونچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو

مانا کہ ہے بیساختہ پن اُسکے بیاں میں
کیا پھونکئے اس ساختہ بیساختہ پن کو

یہ دوست نے حالیؔ کے سنی جبکہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو

کچھ شعر تھے یاد اُن کے پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں صاحبو عزت اسی اُردو ہی نے فن کو

سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالیؔ کے سخن کو

حالیؔ کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسم عرب — کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اُسے گود سے لیکر ناگہ — گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جاکر

رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن — جو کہ اندھے ہیں انہیں کچھ بھی نہیں اسکی خبر
لوگ بیٹی کیلئے ڈھونڈھتے ہیں جب پیوند — سب سے اول انہیں ہوتا ہے یہ منظور نظر
ایسے گھر بیاہئے بیٹی کو جو ہو آسودہ — اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانہ کے سارے زن و مرد — اُن کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد — دونوں نزدیک قرابت میں ہوں باہمدگر
جیتے جی مر گئی بس اُن کی طرف سے گویا — جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو — پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بر
بدمزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بدچلنی — کچھ برائی نہیں ذتو نتا ہو داماد اگر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وبال — گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی — زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جبکہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بدتر

شبلی نعمانی

عدل جہانگیری

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہونچی جو خبر
غیظ سے آ گئی ابروئے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بآئین حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

اُس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

مفتی دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتی دیں نے بھی بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اُسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں "تیغ بزن"

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی — تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہ زمن
اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ — جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور — نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں — جن کی رفتار سے پامال تھے مرغان چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع — ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام — خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا — بولے جائز ہے رضامند ہوں گر ورثۂ زن
وارثوں کو جو دیئے لاکھ درم بیگم نے — سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص — قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جبکہ شہنشاہ کو پورا یہ یقین — کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم — تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ میکردم من

قصیدہ

قصیدہ کے لغوی معنی مغز سطبر و غلیظ کے ہیں یعنی گاڑھا اور سخت امغز لیکن شعرا کی اصطلاح میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جو بالقصد کہی گئی ہو اور اُس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اور دوسرے اشعار کے مصرعہ ثانی پہلے شعر کے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اور اسمیں کسی کی تعریف - برائی - پند و وعظ - اخلاقی نکات - زندگی کے واقعات موزوں کئے گئے ہوں - عام طور سے قصیدہ کی دو قسمیں ہیں - (۱) تمہیدیہ (۲) اور خطابیہ

(۱) تمہیدیہ قصیدہ اُس کو کہتے ہیں جس کی ابتدا میں تمہید ہو - اِسے تشبیب یا نسیب کہتے ہیں - اس کے بعد شاعر اصل مقصد یعنی مدح کی طرف رجوع کرتا ہے - اس کو گریز - یا تلخیص کہتے ہیں - اسکے بعد شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں چند اشعار کہتا ہے - اس کے بعد اپنے مدعا کا اظہار کرتا ہے اور دعا پر قصیدہ ختم کرتا ہے -

(۲) خطابیہ قصیدہ میں تمہید اور گریز نہیں ہوتی - شروع ہی سے شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرنے لگتا ہے - اسکے بعد اظہار مدعا - اور آخر میں دعا پر قصیدہ کو ختم کرتا ہے -

قصیدہ ایک طولانی نظم ہوتا ہے جس میں کم سے کم پندرہ اشعار کا ہونا لازمی ہے اس لئے کہ اس میں "معنی جلیلہ کثیرہ" مندرج ہوتے ہیں جو تھوڑے سے اشعار میں بیان نہیں ہو سکتے - ایک مکمل قصیدہ میں سو ڈیڑھ سو شعر ہوتے ہیں - طرز بیان غزلوں سے مختلف ہوتا ہے - الفاظ شان دار - دقیق - اور بلیغ ہوتے

ہیں۔ شوکت و جزالت ہر قدم پر مد نظر رہتی ہے۔ کلام سے شاعر کی نظر بلیغ اور علمی معلومات کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اس کے تخئیل کی بلند پروازی تشبیہہ اور استعاروں کی ندرت اور الفاظ و محاورات کا برمحل استعمال سب کچھ قصیدہ میں ظاہر ہوتا ہے۔

فی الحقیقت قصیدہ بڑی کار آمد صنف سخن ہے یا ہو سکتی تھی۔ انسانیت کو سنوارنے میں اس سے بہت زیادہ کام لیا جا سکتا تھا۔ اور قدیم شعرائے عرب نے اس صنف سخن سے بڑے بڑے کام لئے بھی تھے۔ لیکن اُردو میں یہ صنف سخن فارسی سے زیادہ متاثر ہو کر آئی لہذا اس میں حقیقی تنقید حیات کے عناصر سے زیادہ مبالغہ۔ بے جا مدح۔ آورد اور تصنع پائی جاتی ہے۔ اور پسندیدہ سیرت نگاری کا بہت کم شائبہ ہوتا ہے۔

شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام کی تبدیلی اور زوال کے بعد قصیدہ گوئی کا بھی زوال ضروری تھا اور یہی ہوا۔ بادشاہوں کے دربار۔ نواب اور شاہزادوں کی صحبت۔ راجہ مہاراجوں کی محفل عیش و سرود قصیدوں کی ترقی و نشو و نما کے گہوارے تھے۔ جب یہ خواب و خیال اور افسانہ ہوئے تو شعرا کی طبع رسا نے مذہبی پیشواؤں کے دامن سے اور زیادہ وابستگی اختیار کی پہلے بارگاہ دینی اور دنیوی دونوں کا سہارا تھا اور اب صرف بارگاہ دینی پر ہی بھروسہ رہ گیا شعرا نے اپنا سارا زور طبع مذہبی قصیدوں میں دکھانا شروع کیا اور اس میں شک نہیں کہ انہیں اس میں تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی۔

اُردو میں یوں تو ہر شاعر نے دو چار قصیدے موزوں کئے ہیں لیکن سب سے اچھے قصیدہ نگاروں کی فہرست بڑی مختصر ہے۔ قدما میں سودا اور ذوق بہترین

قصیدہ گو تھے لیکن دوسرے چوٹی کے قصیدہ گویوں میں انشا۔ غالب۔ مومن اور منیر۔ بھی ہیں۔ آخر الذکر اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر سودا اور ذوق سے بھی آگے ہیں۔ شعرائے متاخرین میں امیر داغ اور جلال بھی اچھے قصیدے کہتے تھے۔ عہد حاضر میں عزیز۔ صفی۔ محشر پیش پیش تھے۔

قصیدہ

مرزا محمد رفیع سودا

در مدح نواب وزیر الممالک عماد الدولہ مدار المہام آصف جاہ نظام الملک بہادر

کہے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر
سمجھ کے دفتر قسمت کیا کر اب تحریر

یہ روز و شب تو بنائیگا تا کجا اس طرح
کہ جام مہر میں آتش دے مہ کو کاسہ شیر

گمان و عہد نہ کر اب تو بحر دنیا سے
گہر نکالے تو عریاں حباب پہنے حریر

رہائی اس میں ہے تیری کہ کاغذ سابق
دست کر لے عطارد کو کر کے اپنا شیر

وہ سلطنت کا نمونہ جسے خدائی کا
کہیں ہیں شرق سے تا غرب ہر صغیر و کبیر

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک
جو میر بخشی تھا وانکا سو اب ہوا ہے وزیر

اگر طلب کرے کاغذ وہ تجھ سے ای ناداں
تو کر سکیگا پھر اوس وقت اسکی کچھ تدبیر

دیا جواب یہ اون نے کہ میرے کاغذ میں
حضور اسکی کسی وجہ کی جو ہو تقصیر

یقیں ہے خامۂ دست کرم سی اسکے مجھی
سوائے عفو مرے حق میں کچھ نہو تحریر

میری خطا بھی ہے کچھ چیز اوسکی ہمت یاں
ہر ایک لحظہ جو بخشا کرے ہے گنج خطیر

گہر فشاں ہے سدا دست فیض کا اسکے
تگرگ بار نہو جسکے ابر عشر عشیر

غنی ہوا ہے یہ اُسکے کرم سے ہر محتاج
کہ فرق ہو نہیں سکتا بہم امیر و فقیر

تمیز کیا کہوں اجرائے کار کی اسکے
کہ جس کے رمز کو پہونچے نہ آسماں کا دبیر

دوام زلف بتاں سے کرے اُسے تنخواہ
جو مانگے فرقۂ عشاق سے کوئی جاگیر

بیاں میں کیا کروں اسکی شجاعت اے جسکو
یہ کہتے ہیں صف مرداں میں کیا جواں کیا پیر

عجب نہیں ہے کہ قالب تہی کرے مریخ
اگر وہ چرخ پہ چڑھتے سنے تری شمشیر

برش کی اسکے جو دہشت نہ ہو زمانے کو
تو ہووے رنگ نہ اس کا ہر ایک دم تغیر

جہاں کے باغ میں نقاش تیرے گلگونکی
جو چاہیں شکل بنا دیں تو کیا کریں تدبیر

کہا مصور باد بہار نے جس کو
اگر قیاس میں ٹھہرے تو کھینچئے تصویر

نہیں ہے مرکز خاکی پہ اسکی جلدی کا
بجز طبیعت معشوق کچھ عدیل و نظیر

ثنا میں صفحۂ کاغذ پہ تیرے ہاتھی کی
قلم کو ہاتھ میں لے کیا بیاں کروں تحریر

صف عدو کے لئے رزم میں ہر روز سیاہ
ہے شمع بزم محباں کے واسطے شب قیر

بجا ہے گر کہوں اسکو اندھیری ساون کی
چوئے ہے مستی سے اس طرح جوں سحاب مطیر

یہ پرورش ہے جہاں کی تری عدالت سے
کہ بچہ شیر کا اور گوسپند ہے ہمشیر

اگرچہ فتح دکن بیچ جا کے اکبر نے
لیا ہے بھاگ نگر اور قلعۂ آسیر

عزیمت اسم کو تیرے اگر پڑھے کوئی
کرے وہ ہند میں بیٹھا ستاروں کو تسخیر

پس اس طرح کے بشر کی کوئی ثنا مجھ سا
اگر کرے تو وہ ہوتا ہے واجب التعزیر

اگرچہ میں یہ قصیدہ کہا تو ہے لیکن
تری ثنا کی مصنف ہو یہ زبان تقصیر

کرے ہے عرض سودا ہمیشہ عالم کا
رہے تو کارکشا اے امیر ابن امیر

ذوق

در تہنیت نوروز

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ — دیکھکر بھاگے جسے رنج ہزاروں فرسنگ

واہ کیا گلشن آفاق میں ہے جوش بہار — چہچہے کرنے لگی بلبل تصویر فرنگ

خسروا آج کیا تونے وہ جشن نوروز — دیکھکر جشن کے تجمل کو ہو جمشید بھی دنگ

مشک افشاں ہو جہاں میں جو تری نکہت خلق — ناف آہوئے ختن سے نہ ہو کم داغ پلنگ

بلکہ ہو جوش بہاران کرم سے تیرے — کیا عجب شاخ میں آہو کے گل رنگارنگ

تیرے انصاف سے ہے بزم جہاں میں شاہا — شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ

ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتش قہر — تو سمندر رہے پانی میں بجائے خرچنگ

ق

زیر ران تیرے ہے وہ توسن چالاک کہ تو — چھیڑ دے ایک ذرا اس کو جو وقت صف جنگ

یوں کرے جست کہ جیسے سر میدان نبرد — منہ سے اڑجائے مریضوں کے تیری خوف سے رنگ

مرغ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ — اور جگہ چوب قفس کے ہے تیرا تیر خدنگ

ہووے حاسد کو نہ آزار حسد سے صحت — تاکہ دارو نہ پیالہ میں بھرے تیری تفنگ

مفسد و حاسد و غماز و عدوے سرکش — زیر شمشیر غضب تیرے ہوں چاروں چورنگ

آنہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام — ہوتا ہے قافیہ سبھوں کا یہاں قافیہ تنگ

ق

کرتا اس رنگ سے ہے ختم سخن دیکے دعا — ذوق جو ہے ترا مداح محبت یک رنگ

گلشن دہر میں ہر سال مبارک تجھ کو — جشن نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ

اور رہے حاسد بدبیں کو دکھائیں لاکھوں — خسروا روز نئے رنگ فلک نیرنگ

غالب

صبحدم دروازۂ خاور کھلا — مہر عالمتاب کا منظر کھلا

خسرو انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانب مشرق نظر — اک نگار آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھدیا ہے ایک جام زر کھلا

بزم سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاج زریں مہر تاباں سے سوا — خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — راز ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں — مقصد نہ چرخ ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے — عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — ق — تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا

نقش پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

مجھ پہ فیض تربیت سے شاہ کی — منصب مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک　میری حد وسع سے باہر کھلا
تھا دل وابستہ قفل بے کلید　کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار　مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرم غزلخوانی نفس　لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا　کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے　یار کا دروازہ پاویں گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ　دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ　زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں　کب کمر سے غمزہ کے خنجر کھلا
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ　رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوز دل کو کیا کرے باران اشک　آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامہ کے ساتھ آگیا پیغام مرگ　رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو غالبؔ سے اگر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال　پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامہ نے پائی طبیعت سے مدد　بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ　عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا　بادشہ کا رایت لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوئے پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیار آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآل سعئ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریب طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفتر مدح جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش ناتمام — عجز اعجاز ستائش گر کھلا

جانتا ہوں ہے خطِ لوح ازل — تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک — ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

منیر شکوہ آبادی

در مدح نواب رام پور

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موجزن جھیلیں ندیاں جاری

بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پہ
اودی اودی سنہری زنگاری

کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے
سبز مخمل سے بھی سوا پیاری

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پُروائی
لہریں لیتی ہیں ندیاں ساری

ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں
روح پر ہوتی ہے خوشی طاری

کوکلے بگلے کوئلیں طاؤس
اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری

قازیں مرغابیاں بطیں سُرخاب
جھیلوں کے ساتھ کرتے ہیں یاری

کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دل داری

سیر مچھی بھون کی چل کر دیکھ
کیا نمایاں ہے قدرت باری

ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں
نہر یا جوئے شیر ہے جاری

مہندیوں سے ہتھیلیاں گلنار
ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری

کھمبے چاندی کے ریشمی جھولے
ساز عشرت کی گرم بازاری

گا چکی ہیں منیر کی غزلیں
اب ہے ساون ملار کی باری

نقل ہر ایک ہے مطابق اصل
رنج و غم پر بھی ہے خوشی طاری

ہاتھ آتا نہیں کوئی مضمون
ذہن کرتا نہیں مددگاری

روئے خورشید ہو گیا پنہاں
شام نے کھولی زلف طراری

مینھ برستا ہے ہوں میں گھر میں
شمع روشن ہے رات اندھیاری

خامہ و کاغذ و دوات و کتاب
دل میں فکر آنکھوں میں ہے بیداری

ناگہاں کھل گئی مری قسمت
بار غم سے ملی سبکساری

دیکھتا کیا ہوں شاہد معنی
محو ناز و ادا و طراری

شفقی ہونٹھ چمپئی رنگت
سُرمئی آنکھیں ڈورے گلناری

لغزش برق جلوۂ طاؤس
چال رفتار کبک کہساری

آنکھیں پتھرا گئیں تحیّر سے
دل پر اک بیخودی ہوئی طاری

اُٹھ کے اُفتادگی نے کی تسلیم
پائے بوسی نے کفش برداری

خاکساری نے فرش کیں آنکھیں
سر نے کی پانوں کی پرستاری

ہاتھوں نے دوڑ کر بلائیں لیں
دل نے کی بڑھ کے منت وزاری

میں نے پوچھا کہ اے مہ بے مہر
فلک عالم جفا کاری

خاک چھنوا رہی ہے عالم میں
شعرا کو تری طلب کاری

کون سے برج میں ترا گھر ہے
کس فلک پر ہے شوق سیاری

ہنس کے اس بت نے یہ جواب دیا
لب شیریں سے کی شکر باری

میں ہوں اُن شاعروں کی خدمت میں
جو کہ نواب کے ہیں درباری

دیکھ تو رام پور کی برسات
کیا نمایاں ہے قدرت باری

مثنوی

مثنوی کا لفظ منسوب ہے مثنیٰ سے جس کے معنی دو دو ہوتے ہیں مثنوی کا ہر شعر بیت یا مطلع ہوتا ہے یعنی ہر شعر ہم قافیہ وہم ردلیف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بعض حضرات مثنوی کا دوسرا نام ابیات بتاتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں ابیات مختلف القوانی کو مثنوی کہتے ہیں۔ مثنوی کا ہر شعر قافیہ ورد دیف کے لحاظ سے دوسرے شعر مختلف ہوتا ہے قدیم شعرا نے مثنوی کے لئے سات بحریں مخصوص کرلی تھیں کہ جب ان میں نظم موزوں ہو تو مثنوی کہلائے دور حاضر میں بعض شعرا اس کے پابند نہیں ہیں۔ مثنوی طولانی بھی ہوتی ہے اور مختصر بھی۔ ہزاروں شعر کی مثنوی بھی ہے اور چند اشعار کی بھی۔ اور چونکہ ردیف وقافیہ کی بہت زیادہ پابندی نہیں ہوتی اس لئے شعرا آزادی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ بیان میں تسلسل ضروری سمجھا جاتا ہے اگر یہ قائم نہ رہے تو مثنوی کا حسن جاتا رہتا ہے اگر موقع اور محل کی وجہ سے کبھی اس رابطہ کو منقطع کرنا پڑتا ہے تو شاعر اِس تسلسل کو پھر سے قائم کرتا ہے۔ گویا ظاہری اور باطنی تسلسل کے بغیر کامیاب مثنوی نہیں لکھی جا سکتی، مثنوی اپنے موضوع کے اعتبار سے موسوم کی جاتی ہے اگر داستان عشق نظم کی گئی ہے تو اسے عشقیہ مثنوی کہیں گے۔ اگر واقعہ نگاری ہوئی ہے تو تاریخی مثنوی کہیں گے۔ اسی طرح اخلاقی مثنوی۔ مذہبی مثنوی۔ صوفیانہ مثنوی، رزمیہ مثنوی۔ سب اپنے موضوع کے اعتبار سے نام پاتی ہیں۔

مثنوی خاص ایرانیوں کی ایجاد کردہ صنف سخن ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے نظم کرنے کا پورا حق بھی انھوں نے ادا کیا ہے۔ فردوسی نے شاہ نامہ جو رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے لکھ کر ایرانی ادب کو نشاۃ ثانیہ کا درجہ عطا کیا ہے۔ مولانا

رُوم نے مثنوی معنوی لکھ کر صوفیانہ مثنوی کو معراج عطا کی ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے۔

مثنوی مولوی معنوی　　　　ہست قرآں در زبان پہلوی

خمسہ نظامی سے کون واقف نہیں ہے۔ اُردو میں ابتدائی دور کے شعرا نے بہت اچھی مثنویاں لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ قلی قطب شاہ کے یہاں چھوٹی چھوٹی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح معراج العاشقین، پنچھی نامہ۔ تحفہ عاشقان وغیرہ ملتی ہیں۔ لیکن اُردو میں جن مثنویوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے وہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور نسیم کی مثنوی گلزار نسیم ہے۔

میر حسن

سلطان ابراہیم ادھم کے تخت و تاج چھوڑنے کا سبب

بات آئی یاد اور عبرت فزا — اُس کو لکھتا ہوں مفصل چند جا

تھا جو ابراہیم ادھم بادشاہ — صاحب تاج و سریر و عز و جاہ

مالک ملک بخارا و بلخ — حاکم افواج جوں مور و ملخ

دولت و حشمت ز اندازہ بروں — کثرت اولاد ہم از حد فزوں

کچھ نہیں اعدا سے رکھتا تھا خطر — جس کو چاہے خود کرے زیر و زبر

اُس عظیم السلطنت کو چھوڑ کر — دشت پیما کیوں ہوا دل توڑ کر

چھوڑ کر یہ اختیار و اقتدار — کر دیا کیوں آپ کو خود خاکسار

کون سی دل کو لگی تھی اسکے چوٹ — ہو گیا کس چوٹ سے دل لوٹ پوٹ

ایک تھی سلطان ادھم کی کنیز — باوفا و باحیا و باتمیز

ہر زماں وہ دست بستہ باادب — رہتی تھی خدمت میں شہ کی روز و شب

گرچہ وہ لونڈی تھی از بس عاقلہ — پر کیا اک دن قضا نے غافلہ

تھا جو شہ کی استراحت کا پلنگ — اس کے اوپر جا کے لیٹی بیڈھنگ

چل رہی تھی اُس گھڑی بادِ صبا — اُس پہ آخر نیند نے غلبہ کیا

خوابِ غفلت میں وہ ایسی آ گئی — کچھ نہ سدھ بدھ اپنی تن من کی رہی

لیکن اک دم بھر نہ سوئی تھی وہ آہ — آن پہونچا سر پہ اُس کے بادشاہ

حکم پھر ارباب خدمت کو دیا — اس خطا کی جلد دو اُس کو سزا

ہر طرف سے اُس پہ گو پڑتی تھی مار
مار پر ہنستی رہی پر بے شمار

مار پر اِس طور سے ہنستی رہی
خندہ زن ہو جس طرح کبک دری

دیکھ کر یہ حال وردِ ہر زباں
الاماں تھا الاماں تھا الاماں

شہ نے یہ طرفہ جو دیکھا ماجرا
دل میں کہتا تھا کہ ہے کیا ماجرا

سچ بتا کیا دل میں تیرے ہے بھرا
مار پر ہنستی رہی کیوں برملا

راستی کا وہ جو رکھتی تھی شعار
راست ہی اُس نے کیا یوں آشکار

اس بچھونے پر میں سوئی ایک دم
اس لئے کھینچے ہیں کیا کیا رنج و غم

جو کہ سویا ہوگا ہر صبح و مسا
حال اس کا ہوگا کیا روز جزا

شہ نے یہ عبرت زدہ سن کر بیاں
لی پکڑ انگشت حیرت در دہاں

پہلے ان باتوں پہ شاباش کر گئے
پھر تو روئے اس قدر غش کر گئے

مثنوی گلزارِ نسیم

داستان تاج الملوک شاہزادہ اور زین الملوک بادشاہ مشرق کی

روداد زمان باستانی　　یوں نقل ہے خامے کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ　　سلطان زین الملوک ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ　　دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دئے تھے چار فرزند　　دانا عاقل ذکی خردمند
نقشہ اک اور نے جمایا　　پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
اُمید کے نخل نے دیا بار　　خورشید حمل ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہر انور　　وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو　　چشمک تھی نصیب اس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے　　ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو　　پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفل ابتر　　مانند سرشک دیدۂ تر
پردہ سے نہ دایہ نے نکالا　　پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
تھا افسر خسروان وہ گلفام　　پالا تاج الملوک رکھ نام
جب نام خدا جواں ہوا وہ　　مانند نظر رواں ہوا وہ
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ　　نظارہ کیا پسر کا ناگاہ
صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی　　بینائی کے چہرے پر نظر کی

پھر لب بشہ نے رو نمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا — اس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور — خارج ہوا نور دیدہ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور — لایا کوئی جا کے سرمہ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور — بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے — مختار ہے جس طرح بنا ہے

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزہ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاولی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غُل سے — اُٹھی نکہت سی فرش گل سے
مُنھ دھو کے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پر اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو نے دیکھا گدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سُنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا۔
نام اس کا صدا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک پتا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزے سے راست مو براندام
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اسکے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اُس کی جو کھینچیے سزا ہے
یہ کہہ کے جنون میں غضبناک — خوں روئی لباس کو کیا چاک
گُل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
کہتی بھی پری کہ اُڑ کے جاتی — گلچیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی — اُس رنگ کے گُل کی بو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتّا کہیں حکم بن ہلا ہے

آزاد دہلوی

حب وطن

ہے قول جملہ تجربہ کاران فارسی
اور کہتے ہیں یہ نظم نگاران فارسی

حب وطن ز ملک سلیمان نکوتر است
خار وطن ز سنبل و ریحان نکوتر است

سلطان دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے
اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملک مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور
اس سلطنت کو چاہئے طرز نظام اور

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حب وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل دید
آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید

حب وطن اسے بھی نہیں کہتے اہل ہوش
یاد وطن میں ہوئے گہے جوش و گہ خروش

حب وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

آیا یہ دھیان آج جو وقت سحر مجھے
اک نقل یاد آ گئی اس اصل پر مجھے

دلی کہ جو ہمیشہ سے کان کمال ہے
جو باکمال اس میں ہے وہ بےمثال ہے

اک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دلی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت زر اس کے واسطے
اور نقد بہر زاد سفر اس کے واسطے

ہر چند منہ تو دلی سے موڑا نہ جاتا تھا
پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا

مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے
اسباب سارا راہ سفر کا سنبھال کے

دلی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے
پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے.

پہنچے مگر ابھی تھے در راج گھاٹ | جو دفعتاً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر
دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا ان کا دل | اور دلی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اُن کا دل
منہ پھیر کر نگاہ جو نہی شہر پر پڑی | جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی
تب وہ پیام بر کہ جو آیا دکن سے تھا | اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہ یاس سے اور اس سے یہ کہا | پیچھے چلیں گے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں | منہ دیکھ کر وہ ان کا ہنسا اور کہا نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا | مسجد بھی اس طرح کی دکھادو واں بھلا
وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے | اس خانہ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے | اُتری زمیں پہ جس کی شبیہہ آسمان سے
یہ بات اُس کی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے | اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے
جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں | سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں
اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں | پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں
اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑی بان پھیر | گر اب پھرے نہ یاں سے تو قسمت کا جان پھیر
ہم اپنی دلی چھوڑ دکن کو نہ جائیں گے | گر یاں بہت نہ کھائیں گے تھوڑا ہی کھائینگے

ایسے ہی ننگ حب وطن بد نصیب ہیں
گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں

اور ہے لکھا مورخ عہد قدیم نے | روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے
تیار اہل فوج پئے کارزار تھے | پر اہل ملک ان سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریب شہر | اُٹھے برائے جنگ امیر و غریب شہر

پر اُن میں کوکلیز جو مرد دلیر تھا
حب الوطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا

نکلا وہ سج کے اسلحۂ جنگ اپنے شہر سے
اور لشکر عدو کی طرف آیا قہر سے

دو جان نثار حب وطن اور ساتھ تھے
اعدا کے خوں میں ڈوبے سدا جنکے ہاتھ تھے

ہے جیسا بحر گنگ کا مائی لقب یہاں
تھے ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں

وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر
پل سے اتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر

پل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے
اعدا کے خون بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے

اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم
حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم

مسمار ادھر وہ کرتے رہے پل کو آن کر
یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر

پل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا
اک آدمی کا راہگذر جبکہ رہ گیا

تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم
اے میرے پیارے ہم وطنو غم نہ کھاؤ تم

قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو۔ چھوڑ دو مجھے
تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے

اک اک رفیق جبکہ اُدھر پار ہو گیا
اور پل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا

للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے
اور ٹائبر میں کہہ کے یہ کودا دھڑام سے

ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو
اے میرے باپ بھیجو اپنے سپاہی کو

دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی
اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی

دیکھو تو فیض حب وطن اس کو کیا ملا
جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

حالیؔ

برکھا رُت

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانیوالی

قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کیلئے کتاب عرفان

وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی

وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات

آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد

وہ آئی تو آئی جان میں جان
سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار

تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک

بجھتی نہ تھی آتش درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی

پانی سے تھی سب کی زندگانی
میلا تھا وہیں جہاں تھا پانی

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماہی کچھ اور

پروا کی دھائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے نظر خدا کی آتی

سورج نے نقاب لی ہی منہ پر — اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر

باغوں نے کیا ہے غسل صحت — کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل — ہے گونج رہا تمام جنگل

ہیں شکر گزار تیرے برسات — انسان سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تکی جاہ تیری — سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے ہے کھلا یہ راز قدرت — راحت ملتی ہے بعد کلفت

شکر یہ فیض عام تیرا — پیشانی دہر پر ہے لکھا

گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے

شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں — کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا — اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ — ایک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

مرثیہ

مرثیہ کے لغوی معنی 'صفتِ مردہ' یا وصفِ میّت کے ہیں لیکن اصطلاحِ شعرا میں اُس صنفِ نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی عزیز۔ دوست یا رہنمائے ملّت وقوم کے انتقال پر اظہارِ حزن وملال کیا جائے۔ اس کی زندگی کے واقعات وحالات بیان کئے جائیں۔ اُسکی تعریف وتوصیف کی جائے۔ اس کی سیرت کو اُجاگر کیا جائے۔ ان چیزوں کا بیان ایسے دردناک افسوس ناک لب ولہجہ میں ہونا چاہئے کہ دوسروں کا دل اُس سے متاثر ہو۔ یہی مرثیہ ہے۔ اس میں حزنیہ عنصر کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ یوں تو بزرگانِ دین جن کو دنیا سے رحلت کئے ہوئے سیکڑوں برس ہو چکے ہیں اُن کی تعریف وتوصیف اب بھی قصائد اور دوسری نظموں میں کی جاتی ہے لیکن یہ نظمیں مرثیہ نہیں کہلاتیں۔

دنیا کی ہر زبان میں مرثیہ کا وجود ملتا ہے۔ اُردو میں بھی مرثیے کثرت سے لکھے گئے ہیں اور بعض خصوصیات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان مرثیوں کی دو صورتیں ہیں (۱) شخصی مرثیے۔ (۲) واقعاتِ کربلا سے متعلق مرثیے۔

شخصی مرثیوں کی مثال میں حالیؔ کا مرثیہ غالبؔ۔ شبلی کا مرثیہ اسحٰق اقبال کا مرثیہ داغؔ۔ اور چکبستؔ کا مرثیہ تلک پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر اُردو میں مرثیوں سے وہی مرثئے مراد ہوتے ہیں جن میں امام حسین علیہ السلام اور اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی شہادت کے واقعات موزوں ہوتے ہوں۔

ظاہری صورت و شکل کے اعتبار سے مرثئے مفرد۔ مثلث۔ مربع اور مخمس ہر شکل میں پائے جاتے ہیں لیکن اچھے مرثئے مسدس کی صورت میں ہیں یعنی ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ اردو مرثیے میں صرف واقعہ نگاری یا سیرت نگاری ہی نہیں ہوتی بلکہ رزمیہ شاعری کی بھی اچھی مثالیں اس میں ملتی ہیں جس کی اردو میں ایک حد تک کمی تھی یعنی اس میں جنگ و جدال۔ شہسواری۔ تیر اندازی۔ تیغ زنی۔ بہادری کے تیور۔ سپاہیانہ آن بان کے مناظر سب کچھ نظم ہوتے ہیں۔ ان سے دل میں جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور شریفانہ جذبات لہریں مارتے ہیں۔ ان کے پڑھنے اور سننے سے جوہر انسانیت و شرافت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان مرثیوں میں صبح کی آمد۔ ورود شام۔ دھوپ اور لوں کی شدت۔ مرغان چمن کی خوش الحانیاں۔ اور پھولوں کی شگفتگی و پژمردگی کے فطری مناظر بھی نظم کئے جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اردو مرثیوں میں واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ فطرت نگاری اور حقیقت نگاری بھی پائی جاتی ہے۔

ابتدا میں شعرائے اردو حصول ثواب کیلئے مرثئے لکھتے تھے یہ مرثئے زیادہ تر حسرت و غم۔ آہ و بکا۔ اور نالہ و شیون کی تصویریں ہوتے تھے۔ ان میں شاعرانہ حسن بہت کم ہوتا تھا۔ مرزا سوداؔ نے ان میں نئی راہیں نکالیں۔ زبان اور بیان کی خوبیاں۔ درد انگیز لب و لہجہ۔ جذبات اور احساسات میں امتیازی شان یہ سب سوداؔ کے مرثیوں کی خصوصیات ہیں۔ میر ضمیر نے مرثیوں کو صرف مسدس میں نظم کرنا شروع کیا اور دوسرے اجزائے مرثیہ یعنی چہرہ۔ سراپا۔ رخصت۔ آمد۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت۔ بین

وغیرہ بھی شامل کئے۔ ان چیزوں کو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے معراج کمال پر پہونچا دیا۔ ان کے زمانے میں مرثیہ صرف رونے رلانے ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس میں شاعرانہ نزاکتیں اور لطافتیں بھی پائی جانے لگیں۔ سو سو بند ڈیڑھ ڈیڑھ سو بند کے مرثئے لکھے اور خراج تحسین حاصل کیا۔ ان حضرات کے بعد رشیدؔ نے مرثیوں میں رنگ تغزل اور ساقی نامہ کا بھی اضافہ کیا جس کی پیروی دوسرے مرثیہ نگاروں نے بھی کی۔ عہد حاضر میں مرثیہ نگاروں نے اخلاقی پہلو اور سیرت شہدائے کربلا پر زیادہ زور دیا ہے۔ اثرؔ لکھنوی اور جوشؔ ملیح آبادی نے ایسے ہی مرثئے نظم کئے ہیں۔

انیس

چہرہ

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جبتک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہر منور سے ملا دوں — خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

گر بزم کی جانب ہو توجہ دم تحریر — کھنچ جائے ابھی گلشن فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبت انجم فلک پیر — ہو جائے ہوا بزم سلیماں کی بھی توقیر
یوں تخت حسینان معانی اُتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

آؤں طرف رزم ابھی چھوڑ کے جنت تم — خیبر کی خبر لائے مری طبع الوالعزم
قطع سر اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم — دکھلائے یہیں سبکو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

واقعہ نگاری

شعبان کی ہے تاریخ سوم روزِ ولادت — اور ہے دہم ماہ عزا یوم شہادت
دونوں ہیں بہر حال ہے تحصیل سعادت — وہ بھی عمل خیر ہے یہ بھی ہے عبادت
مداح ہوں کیا کچھ نہیں اس گھر سے ملا ہے
کوثر ہے صلا اس کا بہشت اس کا صلا ہے

قربان شب جمعۂ شعبان خوش انجام — پیدا ہوا جس شب کو محمد کا گل اندام
قائم ہوا دیں اور بڑھی رونق اسلام — ہم پلۂ صبح شب معراج تھی وہ شام
خورشید کا اجلال و شرف بدر سے پوچھو
کیا قدر تھی اس شب کی شبِ قدر سے پوچھو

تھیں فاطمہ بیچین ادھر درد شکم سے — منہ فق تھا اور آنسو تھے رواں دیدۂ نم سے
وابستہ تھی راحت جو اسی بی بی کے دم سے — مضطر تھے علیؑ بنت پیمبر کے الم سے
آرام تھا اک دم نہ شہ قلعہ شکن کو
پھرتے تھے لگائے ہوئے چھاتی سے حسنؑ کو

ناگاہ در حجرہ ہوا مطلع انوار — دکھلانے لگے نور تجلّی در و دیوار
اسمانے علیؑ سے یہ کہا دوڑ کے اکبار — فرزند مبارک تمہیں یا حیدر کرار
اسپند کرو فاطمہ کے ماہ جبیں پر
فرزند نہیں چاند یہ اُترا ہے زمیں پر

مژدہ یہ سنا احمد مختار نے جس دم — بس شکر کے سجدہ کو جھکے قبلۂ عالم
آئے طرف خانۂ زہرا خوش و خرم — فرمایا مبارک پسر اے ثانیٔ مریم

چہرہ مجھے دکھلا دو مرے نورِ نظر کا
ٹکڑا ہے یہ فرزند محمد کے جگر کا
کی عرض یہ اسمانے کہ اے خاصۂ داور — نہلا لوں تو لے آؤں اُدھر حجرے سی باہر
ارشاد کیا احمد مختار نے ہنسکر — لے آکہ نواسا ہے مرا طاہر و اطہر
اس چاند کو تاج سرِ افلاک کیا ہے
یہ وہ ہے خدا نے جسے خود پاک کیا ہے
جس دم یہ خبر مخبرِ صادق نے سنائی — اسما اُسے اک پارچۂ نرم پہ لائی
بو اس گلِ تازہ کی محمد نے جو پائی — ہنسنے لگے سرخی رُخِ پُر نور پہ آئی
منھ چاند سا دیکھا جو رسولِ عربی نے
لپٹا لیا چھاتی سے نواسے کو نبی نے
فرمانے لگے ہنسکے شہ یثرب و بطحا — بھائی کہو فرزند کا کچھ نام بھی رکھا
کی عرض یہ حیدر نے کہ اے سیّد والا — سبقت کروں حضرت پہ یہ مقدور ہے میرا
فرمایا کہ موقوف ہے یہ ربِ علا پر
میں بھی سبقت کر نہیں سکتا ہوں خدا پر
بس اتنے میں نازل ہوئے جبریل خوش الحان — کی عرض کہ فرماتا ہے یہ خالقِ علّام
پیارا ہے نہایت ہمیں زہرا کا گل اندام — یا ختمِ رسل ہم نے حسین اس کا رکھا نام
یہ حسن میں سردارِ حسینانِ زمن ہے
مشتق تو ہے احسان سے تصغیرِ حسن ہے
ہے یہ سبب تہنیت و تعزیت اسدم — ہے شادی و غم گلشنِ ایجاد میں توام
لپٹائے ہیں چھاتی سے جسے قبلۂ عالم — بے جرم و خطا ذبح کرینگے اِسے اظلم

گر حشر بھی ہوگا تو یہ آفت نہ ٹلے گی
سجدے میں چھری حلق مبارک پہ چلے گی

مطلع دیگر

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جسمیں	وہ گل ہے یہ گل بو ئی محبت نہیں جسمیں
وہ دوست ہے یہ دوست مروت نہیں جسمیں	وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جسمیں
بے درد الم شام غریباں نہیں گذری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

رخصت

ہے عالم فانی کی عجب صبح عجب شام	گہ غم کبھی شادی کبھی ایذا کبھی آرام
نازوں سے پلا فاطمہ زہرا کا گل اندام	واحسرت و دردا کہ وہ آغاز یہ انجام
راحت نہ ملی گھر کے تلاطم سے دہم تک
مظلوم نے فاقے کئے ہفتم سے دہم تک

ریتی پہ عزیزوں کا مرقع تو ہے ابتر	شہ کا ہے یہ نقشہ کہ ہیں تصویر سے ششدر
فرزند نہ مسلم کے نہ ہمشیر کے دلبر	قاسم ہیں نہ عباس نہ اکبر ہیں نہ اصغر
سب نذر کو دربار پیمبر میں گئے ہیں
رخصت کو اکیلے شہ دیں گھر میں گئے ہیں

منظور ہے پھر دیکھ لیں ہمشیر کی صورت	پھرے گئی ہے گھر میں سکینہ کی محبت
سجاد سے کچھ کہتے ہیں اسرار امامت	بانوی دو عالم سے بھی ہے آخری رخصت

مطلوب ہے یہ زیب بدن رخت کہن ہو
تا بعد شہادت وہی ملبوس بدن ہو

خیمے میں مسافر کا وہ آنا تھا قیامت — اک ایک کو چھاتی سے لگانا تھا قیامت
آنا تو غنیمت تھا پہ جانا تھا قیامت — تھوڑا سا وہ رخصت کا زمانہ تھا قیامت
وان بین ادھر صبر و شکیبائی کی باتیں
افسانۂ ماتم تھیں بہن بھائی کی باتیں

زینب کی وہ زاری وہ سکینہ کا بلکنا — وہ ننھی سی چھاتی میں کلیجے کا دھڑکنا
وہ چاند سا منہ اور وہ بندے کا چمکنا — حضرت کا وہ بیٹی کی طرف یاس سے تکنا
حسرت سے یہ ظاہر تھا کہ معذور ہیں بی بی
پیدا تھا نگاہوں سے کہ مجبور ہیں بی بی

رجز

تنہائی میں ایک ایک کو حضرت نے پکارا — کون آئے کہ فردوس میں تھا قافلہ سارا
گھوڑے پہ چڑھا خود اسد اللہ کا پیارا — اونچا ہوا افلاک امانت کا ستارا
شوخی سے فرس پاؤں نہ رکھتا تھا زمیں پر
غل تھا کہ چلا قطب زماں عرش بریں پر

اعدا کی زبانوں پہ یہ حیرت کی تھی تقریر — حضرت یہ رجز پڑھتے تھے تولے ہوئے شمشیر
دیکھو نہ مٹاؤ مجھے اے فرقہ بے پیر — میں یوسف کنعان رسالت کی ہوں تصویر
واللہ تعلی نہیں یہ کلمۂ حق ہے
عالم کے مرقع میں حسین ایک ورق ہے

واللہ جہاں میں مرا ہمسر نہیں کوئی — محتاج ہوں پر مجھ سا تونگر نہیں کوئی
ہاں میرے سوا شافع محشر نہیں کوئی — یوں سب ہیں مگر سبط پیمبر نہیں کوئی
باطل ہے اگر دعویٰ اعجاز کرے گا
کس بات پہ دنیا میں کوئی ناز کرے گا

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا — سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا — قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طور تجلا ہے ہمارا
تخت بن داؤد مصلا ہے ہمارا

یہ فرق پہ عمامۂ سردار زمن ہے — یہ تیغ علی ہے یہ کمر بند حسن ہے
یہ جوشن داؤد ہے جو حافظ تن ہے — یہ پیرہن یوسف کنعانِ محن ہے
دکھلائیں سند دست رسول عربی کی
یہ مُہر سلیماں ہے یہ خاتم ہے نبی کی

دیکھو تو یہ ہے کونسے جرار کی تلوار — کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار — بجلی کی تو یہ تجلی ہے تلوار کی تلوار
قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

دم لے کہیں رک کر وہ روانی نہیں اس میں — چلنے میں سبک تر ہے گرانی نہیں اس میں
جز حرف ظفر اور نشانی نہیں اس میں — جل جاؤ گے سب آگ ہی پانی نہیں اس میں
چھوڑیگی نہ زندہ اسے جو دشمن دیں ہے
تابیں نہیں غصے سے اجل چیں بجبیں ہے

اعدا نے کہا قہر خدا سے نہیں ڈرتے　　ناری تو ہیں دوزخ کی جفا سے نہیں ڈرتے
فریاد رسول دوسرا سے نہیں ڈرتے　　خاتون قیامت کی بکا سے نہیں ڈرتے

ہم لوگ جدھر دولت دنیا ہے ادھر ہیں
اللہ سے کچھ کام نہیں بندۂ زر ہیں

جنگ

حضرت نے کہا خیر خبردار صفوں سے　　آیا غضب اللہ کا ہشیار صفوں سے
بجلی سا گزر جاؤں گا ہر بار صفوں سے　　کب بچتنی رکتے ہیں دو چار صفوں سے

غربت کا چلن دیکھ چکے حرب کو دیکھو
لو بندۂ زر ہو تو مری ضرب کو دیکھو

تلوار کی تعریف

جلوہ کیا بدلی سے نکلکر مہ نو نے　　دکھلائے ہوائیں دو سر اک شمع کی لو نے
تڑپا دیا بجلی کو فرس کی تگ و دو نے　　تا کا سپر مہر کو شمشیر کی ضو نے

اعدا تو چھپانے لگے ڈھالوں میں سروں کو
جبریل نے اونچا کیا گھبرا کے پروں کو

بالا سے جو آئی وہ بلا جانب پستی　　بس نیست ہوئی دم میں ستمگاروں کی ہستی
چلنے لگی یکدست جو شمشیر دو دستی　　معلوم ہوا الٹ گئی سب کفر کی بستی

زور اُن کے ہر اک ضرب میں اللہ نے توڑے
ٹوٹیں جو صفیں تب اسد اللہ نے توڑے

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی ندی اُدھر اک خوں کی ابلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

موج بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ یہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کیا صاحب جوہر تھی عجب ظرف تھا اس کا
موقع تھا جہاں جس کا وہیں صرف تھا اس کا

یہ کہکے سکینہ کے بہشتی کو پکارے الفت ہمیں لے آتی ہے پھر پاس تمہارے
لڑتے ہوئے آپہنچے ہیں دریا کے کنارے عباس غش آتا ہے ہمیں پیاس کے مارے
اس سوکھے ہوئے ہونٹوں سے ہونٹوں کو ملا دو
کچھ مشک میں پانی ہو تو بھائی کو پلا دو

شہادت

کہکر یہ سخن رونے لگا بھائی کو بھائی تلوار سے مہلت ستم ایجادوں نے پائی
جس فوج نے رن چھوڑ دیا تھا وہ پھر آئی دو روز کے پیاسے پہ گھٹا شام کی چھائی
بارش ہوئی تیروں کی ولی ابن ولی پر
سب ٹوٹ پڑے ایک حسین ابن علی پر

جھک جاتے تھے مرنے پہ جو غش میں شہ ابرار منھ پھیر کے آقا کی طرف تکتا تھا رہوار
چمکار کے فرماتے تھے شبیر دل افگار اب خاتمۂ جنگ ہے اے اسپ وفادار

اُتریں گے بس اب تجھ سے چھٹا ساتھ ہمارا
نے پاؤں ترے چلتے ہیں نے ہاتھ ہمارا

اترا یہ سخن کہکے وہ کونین کا والی | خاتم سے نگیں گر گیا زیں ہو گیا خالی
اس دکھ میں نہ یاور تھے نہ مولا کے موالی | خود ٹیک کے تلوار کو سنبھلے شہ عالی

کپڑے تن پر نور کے سب خون میں تر تھے
اک ہاتھ کو رہوار کی گردن پہ دھرے تھے

یہ کہکے جو سر کا اسد اللہ کا جایا | اک تیر جبیں پر بن اشعث نے لگایا
فریاد نے زہرا کے دو عالم کو ہلا یا | پیکان سہ پہلو عقب سر نکل آیا

تڑپے نہ زہے صبر امام دو جہاں کا
سوفار نے بوسہ لیا سجدے کے نشاں کا

حضرت نے جبیں سے ابھی کھینچا نہ تھا وہ تیر | جو سر پہ لگی تیغ بن مالک بے پیر
ابرو تک اتر کر جو اٹھی ظلم کی شمشیر | سر تھام کے بس بیٹھ گئے خاک پہ شبیر

چلائے ملک دیکھ کے خوں سبط نبی کا
تھا حال یہی مسجد کوفہ میں علی کا

تھرا کے جھکے سجدۂ حق میں شہ ابرار | شور دہل فتح ہوا فوج میں اک بار
خوش ہو کے پکارا پسر سعد جفاکار | اے خولی و شیث و بن ذی الجوشن جرار

آخر ہے بس اب کام امام ازلی کا
سر کاٹ لو سب ملکے حسین ابن علی کا

مرزا دبیر

حضرت علی اصغر کیلئے پانی مانگنا

"مرزا دبیر صاحب نے اس واقعہ کے بیان میں جو بلاغت صرف کی ہے اور جو درد انگیز سماں دکھایا ہے کسی سے آج تک نہ ہو سکا۔" (شبلی نعمانی)

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ ۔ لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا ۔ منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائیگی اور آبرو مری

پہونچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے ۔ چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے ۔ چادر پسر کے چہرہ سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گر میں بقول عمرو شمر ہوں گناہ گار ۔ یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہا بے زبان نبی زادہ شیرخوار ۔ ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زبان ہے تمہیں کچھ خیال ہے ۔ درِ نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے ۔ یثرب کے شاہ زادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علی کا تم سے طلب گار آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
روکر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورعین نے
تھرا کے آسماں کو دیکھا حسین نے

حالی

مرثیہ غالب

بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اُس کا ایک ٹھٹول
سو تکلف اور اُس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اُس کا تھا اور اُس کی دوات

تھیں تو دلّی میں اُس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اُس کے مرنے سے مر گئی دِلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا!
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا!

دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل ؟
کس سے داد سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح | اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم | لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے | ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت | نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر | تعزیت اک ملال کی صورت
اُس کی توجیہ سے پکڑتی تھی | شکل امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی | رنگ ہجراں وصال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا | سخن اُس کا مآل کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے | انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے | علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے | غالب بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

ہند میں نام پائے گا اب کون | سکہّ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف | اُن پہ ایمان لائے گا اب کون
اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے | اُس کو دل سے بھلائیگا اب کون
تھی کسی کو نہ جس میں گنجائش | وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون
مر گیا قدر دان فہم و سخن | شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مرگیا تشنۂ مذاق کلام　　ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک　　ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں نا تمام ہے حالیؔ
غزل اس کی بنائے گا اب کون

نظم لطیف

اُردو میں نظم لطیف کا وجود زیادہ تر انگریزی ادب کے اثر سے ہوا۔ نظم لطیف اُس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو روایتی اصناف سخن مثلاً غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی وغیرہ کی رسمی پابندیوں سے آزاد ہو۔ جس میں ظاہری شکل وصورت سے زیادہ خیالات اور احساسات پر زور دیا گیا ہو۔ ایسی نظم کا کوئی مخصوص سانچا نہیں ہے اور نہ کوئی خاص اوزان مقرر ہیں۔ بعض شعرائے جدید تو وزن اور قافیہ سے بھی اسے آزاد کئے ہوئے ہیں۔ ایسی آزاد نظموں سے دلچسپی رکھنے والے تعلیم یافتہ حضرات ہیں اور وہی انہیں زیادہ پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ایسی نظمیں موضوع کے اعتبار سے لکھی جاتی ہیں اور اسی اعتبار سے موسوم بھی ہوتی ہیں مثلاً قومی نظمیں۔ اخلاقی نظمیں۔ تاریخی نظمیں وغیرہ مگر عام طور سے ایسی نظموں کی تین قسمیں ہوتی ہیں (۱) بیانیہ نظمیں جن میں کسی شخص چیز یا جگہ کی منظر کشی کی گئی ہو (۲) تاریخی نظمیں جن میں واقعہ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہو۔ (۳) تخیلی نظمیں جن میں جذبات۔ خیالات مسائل زندگی وغیرہ نظم ہوئے ہوں۔

اُردو میں نظم جدید زیادہ تر مولانا آزاد کی کوششوں سے وجود میں آئی روایتی اصناف سخن کی یکرنگی اور بے بضاعتی کا احساس مولانا آزاد کو ۱۸۶۷ء ہی میں ہوا تھا لیکن مشاغل کی کثرت کی وجہ سے وہ کوئی تعمیری جد وجہد نہ کر سکے تھے ۱۸۷۴ء میں مولانا نے ایک مشاعرہ قائم کیا جس میں شعرا نظمیں پڑھتے تھے۔ مصرع طرح کے بجائے موضوع دیدیا جاتا تھا۔ اس مشاعرہ میں مولانا حالی بھی شریک ہوتے اور نظمیں پڑھتے تھے۔ رفتہ رفتہ نظموں کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا گیا اور اب تو گویا میدان نظموں ہی کے ہاتھ ہے۔

اقبال

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کی نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا حکیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو۔ دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اوّل فلک جس کا ہو۔ وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالم تاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینہ سیّال ہے
دامن موج ہوا جس کیلئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برق سر کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اُس کی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہے افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اُس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زُلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

سراغِ زندگی

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کیلئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دنیا ؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا ؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

محبت

شہید محبت نہ کافر نہ غازی — محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے — سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے — تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

نہ محتاج سلطاں نہ مرعوب سلطاں — محبت ہے آزادی و بے نیازی

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

نام پیدا کر

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو — سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفال ہند سے بنیا د جام پیدا کر

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

چکبست لکھنوی

فریاد قوم

یہ نظم اُس زمانہ میں تصنیف کی گئی ہے جب کہ دور افتادگان وطن جنوبی افریقہ میں ٹرنسوال کے حکّام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز تھے اور مہاتما کرم چند گاندھی ان غریب الوطنوں کی حالت درست کرنے کی کوشش میں دل و جان سے مصروف تھے - یہ نظم ایک رسالہ کی صورت میں شایع کی گئی تھی اور مہاتما گاندھی کا نام بہ صورت ذیل زیب عنوان کیا گیا ہے

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی

نثار ہے دل شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اِس نگینے پر

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز ۔ ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز
سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دم ساز ۔ ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

جو مٹ رہے ہیں وطن پر یہ ہے صدا اُن کی ۔ لہو پکار رہا ہے یہ ہے وفا ان کی

بندھی ہے عالم تہذیب میں مؤ اُنکی　　غضب کی جاہے جو گردن جھکے ذرا اُن کی
تمھارے دل میں نہ الفت کی ہوک اُٹھی افسوس
وطن کا قافلہ پردیس میں لٹے افسوس

ٹرانسوال کے حاکم وفا شعار نہیں　　کچھ اُن کے قول کا دنیا میں اعتبار نہیں
ہماری قوم پہ احسان کا اُن کے بار نہیں　　یہ ظلم کیوں ہے ہم اُن کے گناہگار نہیں
اگر وہ دولت برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہل ہند اُسی آسماں کے تارے ہیں

مگر جفا سے نہیں ظالموں کو مطلق عار　　اُجاڑتے ہیں وہ بستی جو تھی کبھی گلزار
جہاں خوشی کے ترانوں کا گرم تھا بازار　　سنائی دیتی ہے واں بیڑیوں کی اب جھنکار
گیا ہے بند مسافر سمجھ کے راہوں کو
پنھائی جاتی ہے زنجیر بے گناہوں کو

لٹے ہیں یوں کہ کسی کی گرہ میں دام نہیں　　نصیب رات کو پڑ رہنے کا مقام نہیں
یتیم بچوں کے کھلانے کا انتظام نہیں　　جو صبح خیر سے گذری اُمید شام نہیں
اگر جئے بھی تو کپڑا انہیں بدن کیلئے
مرے تو لاش پڑی رہ گئی کفن کیلئے

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی　　اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی　　ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کے گنگا میں

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار   اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار   تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو!   وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو   جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو

نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کے یادگار ہو تم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا   دیا تھا دشمن قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا   یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے   نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے   نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے ابتک انکا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش ابتک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا — اِک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک — ہم بے کسوں کو پیارا اپنا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوا اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا — تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اِس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

قوم کے سورماؤں کی الوداع

ساحل ہند سے جرّار وطن جاتے ہیں کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے اِن کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
اِن کے تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اِن کی رگ رگ میں تہی ہوست شجاعت کے چلن ان کا میدان ہے اِن کیلئے ماں کا دامن
عرصۂ جنگ کی موت ان کو ہے اک شب کی دلہن کر کے تلوار سے حاصل ہو تو خلعت ہے کفن
جوش ان میں جو ہے اس جوش کا اب دو رہنیں
ساٹھ پشتوں کے سپاہی ہیں کوئی اور نہیں

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا طنطنہ جرمن خود بیں کا مِٹا کر آنا
قیصری تخت کی بُنیاد ہلا کر آنا ندّیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کیلئے
ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کیلئے

جاں نثار آج تمہارا سا زمانہ میں نہیں ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہ لندن کے نگیں
دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تحسیں آسماں وجد کرے بول اُٹھے ان کی زمیں
یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمکخوار لڑے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

جس گھڑی معرکۂ جنگ میں ہو تیغ علم سورما لڑتے ہیں اس طرح پکارے عالم
دل ہو ارجن کا جگر بھیم کا انگد کا قدم موت کے وقت نظر میں ہو شبیہہ بھیشم

جس کا قابو نہ ہٹا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

ہو وہ یورش کہ ہو شیرازۂ اعدا برہم
اک امنڈتے ہوئے دریا کا ہو پیدا عالم
جو کسی سے نہ جھکا وہ سرِ مغرور ہو خم
پہلے برلن میں جو پہونچے وہ تمہارا ہو قدم
یا "گرو" کہہ کے بڑھو خون کی نہریں کھل جائیں
پھر ہری سنگھ کی تلوار کے جوہر کھل جائیں

تم کو اعزاز ملا۔ ہے یہ وطن کا اعزاز
دیکھنا اب ہے شجاعت کا تمھاری انداز
خاکِ یورپ پہ دلیری سے ہو اپنی ممتاز
تیغِ ہندی کی اصالت پہ زمانہ کو ہو ناز
قوم کا اوج بڑھے نام وطن زندہ ہو
روحِ پرتاب کی جنت میں نہ شرمندہ ہو

یا ظفریاب تمھیں دیکھ کے ہو دل بشاش
آئے یا سوئے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش
سر جدا تن سے ہو یا ہو تنِ بسمل صد پاش
گوشۂ امن و امان کی نہ ہو آنکھوں کو تلاش
موت معراج ہے اس دشت کے راہی کیلئے
آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کیلئے

گو کہ دنیا سے مٹے شوکتِ قیصر کا سراغ
شعلۂ تیغ سے مرجھائے نہ تہذیب کا باغ
گو نہ ہو دل کے شوالے میں حمیت کا چراغ
بے گناہوں کے لہو کا نہ ہو تلوار میں داغ
راستہ ہے یہی قوموں کی تباہی کیلئے
خون معصوم کا دوزخ ہے سپاہی کیلئے

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام
خطّہ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام

تیغ خونریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام
اپنے مسکن میں اُسی شان سے پائے آرام

شاعرِ گوشہ نشیں شکر خدا کرتا ہے
جنگ ہو تم کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

مذہب شاعرانہ

سنہ ۱۹۰۵ء

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا / جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

کیفیت گلشن ہے مرے نشہ کا عالم / کوئل کی صدا نعرۂ مستانہ ہے میرا

پیتا ہوں وہ مے نشہ اترتا نہیں جس کا / خالی نہیں ہوتا ہے وہ پیمانہ ہے میرا

دریا مرا آئینہ ہے لہریں مرے گیسو / اور موج نسیم سحری شانہ ہے میرا

ہر ذرۂ خاکی ہے مرا مونس و ہمدم / دنیا جسے کہتے ہیں وہ کاشانہ ہے میرا

جس جا ہو خوشی ہے وہ مجھی منزل راحت / جس گھر میں ہو ماتم وہ عزاخانہ ہے میرا

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی / کعبہ ہے وہی اور وہی بتخانہ ہے میرا

میں دوست بھی اپنا ہوں عدو بھی ہوں میں اپنا / اپنا ہے کوئی اور نہ بیگانہ ہے میرا

عاشق ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے / دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

خاموشی میں یاں رہتا ہے تقریر کا عالم / میرے لب خاموش پہ افسانہ ہے میرا

کہتے ہیں خودی کس کو خدا نام ہے کس کا / دنیا میں فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

ملتا نہیں ہر ایک کو وہ نور ہے مجھ میں / جو صاحب بینش ہے وہ پروانہ ہے میرا

شاعر کا سخن کم نہیں مجذوب کی بڑ سے
ہر ایک نہ سمجھے گا وہ افسانہ ہے میرا

مولانا محمد علی جوہر

فغانِ دہلی

۳۰ر مارچ سنہ ۱۹۵۰ء

کلمۂ حق ہے اگر وردِ زبانِ دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ دہلی

لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جورِ اغیار
ہو زمانے سے الگ طرزِ فغانِ دہلی

للہ الحمد کشادہ ہے رہِ صبر و صلوٰۃ
ہو کے بے خوف پڑھیں اذاں دہلی

سرفروشی کے لئے پیر و جواں ہیں تیار
آج رونق پہ ہے کس درجہ دکانِ دہلی

سنگریزوں سے زیادہ نہیں گولی چھرّے
یوں رُکے گا نہ کبھی سیلِ روانِ دہلی

حق کے آتے ہی ہوا کعبہ سے باطل رخصت
چند دن اور ہیں دہلی میں بتانِ دہلی

دعائے اسیر

اپنی عزیز بیٹی آمنہ کی علالت پر جسکی اطلاع جیل خانہ میں ملی تھی۔ مولانا کے لڑکا کوئی نہ تھا۔ چار لڑکیاں تھیں۔ ان میں یہ منجھلی صاحب زادی آمنہ مرحومہ عزیز ترین تھیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد شروع ۱۹۲۲ء میں دق میں مبتلا ہوئیں مولانا کو بیجاپور جیل میں اطلاع ہوئی۔ یہ نظم وہیں موزوں ہوئی تھی۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

اُس کی رحمت سے جو مایوس ہو وہ کافر ہے
ہم توکل سے کسی وقت بھی معذور نہیں

امتحاں سخت سہی، پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہے دعا اور دوا فرض ولے حکم خدا
ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اب دعا لب پہ بھی جلدی ہو اگرچہ اُس سے
یوں بھی حال دل مضطر کبھی مستور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
باپ کے دل کو تو یوسف کی طرح ہے وہ عزیز
نہ سہی حسن میں گر خلق میں مذکور نہیں
یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں
مرہم زخم جگر آج بھی ہے صبر جمیل
حزن فرقت سے مگر آنکھ میں اب نور نہیں
میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں
شان رحمت مجھے دکھلا کہ ہو تسکیں کا نزول
دل جو ھر ہے یہ یارب جبل طور نہیں

منشی تلوک چند محروم

عزمِ صحرا

(شری رام چندر جی کی بن کو تیاری اور اہلِ اجودھیا کی بے قراری)

رخصت اجودھیا سے وہ جانِ جہاں ہوا
یا اتفاقِ تفرقۂ جسم و جاں ہوا

پہلو سے دل گیا کہ چلا رام شہر سے
بھاگے نکل کے راحت و آرام شہر سے

گویا بہار چھوڑ کے صحنِ چمن چلی
پر وہ بھی اس طرح نہ کبھی دفعتاً چلی

غم کا غبار لے کے جو آہ رسا گئی
کالی گھٹا بھی چرخ پہ گھنگھور چھا گئی

آہوں میں جو شرار دلوں سے نکل گئے
وہ آسماں پہ برق بنے اور مچل گئے

عالم وہ بجلیوں پہ غضب اضطراب کا
ہائے وہ جوشِ گریۂ پیہم سحاب کا

انساں تو خیر صدمۂ غم سے نڈھال تھے
وحش و طیور تک بھی اسیرِ ملال تھے

بیگانہ طرزِ رقص سے باغوں میں مور تھے
غم سے پروں میں گردنیں ڈالے چکور تھے

رگھوبر چلے کہ شہر خموشاں اودھ ہوا
آباد دشت ہو گیا ویراں اودھ ہوا

صحرا کو رام و لچھمن و سیتا جو چل پڑے
بیتاب ہو کے لوگ گھروں سے نکل پڑے

زار و قطار روتے ہوئے بیقرار سب
تھے پیچھے پیچھے رام کے باحالِ زار سب

تھا ارد گرد رتھ کے وہ خلقت کا اژدحام
گھوڑوں کو گام گام پہ لیتے تھے تھام تھام

کہتے تھے مر ہی جائیں گے اے پران ناتھ ہم
ہم کو نہ چھوڑ جائیے جائیں گے ساتھ ہم

یہ حال دیکھ کر لبِ معجز نمائے رام
گویا ہوئے کہ اہلِ اجودھیا سنو تمام

جاتا ہوں بن کو میں کہ یہ فرماں ہی باپ کا
پہنچانے آپ آے ہیں احساں ہی آپ کا

بہلاؤ جا کے دل شہ پیرانہ سال کا
کم تا کہ ان کے دل پہ ہو صدمہ ملال کا

تشویش کیا تمہیں کہ بھرت تاجدار ہے
عالم ہے رحم دل ہے صداقت شعار ہے

ہے تم پہ فرض اسکی اطاعت بجان و دل
کرتا ہے جب وہ تم سے محبت بجان و دل

ہوگی اسے تمہاری اطاعت سے تقویت
پاتے ہیں شہریار رعیت سے تقویت

پرماتما کے شکر کرو شادماں رہو
سر زیر منت شہ امن و اماں رہو

اور میری واپسی کا جو تم کو خیال ہی
یہ ہے خیال خام یہ امر محال ہی

یہ کہہ کے سارتھی سے اشارہ کیا کہ ہاں
لگتی ہے دل پہ چوٹ بھی سن سن کے زاریاں

بہتر ہے اس ہجوم سے رتھ کو نکالئے
اور ہم کو راہ دشت پہ جیسے ہو ڈالئے

چلنے سے رتھ کے اور قیامت بپا ہوئی
یعنی بلند شورش آہ و بکا ہوئی

رکھے ہوئے جگر پہ کلیجے پہ ہاتھ سب
روتے ہوئے روانہ ہوئے رتھ کی ساتھ سب

جو تھے جواں وہ گھیر کے رتھ کو رواں ہوئے
جو ناتواں ضعیف تھے پیچھے رواں ہوئے

کہتے ہوے کہ اتنے تو ہم سے خفا ہو رام
صحرا نورد صورت موج صبا ہو رام

یوں تیز تیز کس لئے رتھ کو اُڑا چلے
بوڑھوں کو گرد راہ میں رگھوبر ملا چلے

لیکن رہے خیال کہ مرنے کے ہم نہیں
یہ زیست ہم کو موت سے اے رام کم نہیں

ہم سر کے بل چلیں گے اگر پاؤں ٹوٹ جائیں
مل جائے کاش موت اگر تجھ سے چھوٹ جائیں

حیرت ہے آج قفل دہن کھولتے نہیں
مہر سکوت لب پہ ہے کچھ بولتے نہیں

سنتے نہیں ہو آج برہمن کی التماس
تکریم کا خیال کدھر ہے کہاں ہے پاس

اے رام کیا ہوئیں وہ ترے دل کی نرمیاں
کیوں سرد پڑگئیں وہ محبت [illegible]

بیٹھے تھے ہم تو جشن کا ساماں کئے ہوئے — جاتے ہیں آپ عزم بیاباں کئے ہوئے

واپس اودھ کو جائیں تو کس منہ سے جائیں ہم — اپنا اودھ وہیں ہے جہاں تجھکو پائیں ہم

وہ پھول تو ہے جس کی پھبن سے سماں رہا — لطف بہار شام اودھ اب کہاں رہا

جنگل اجودھیا ہے تو صیاد دیکھئے — کچھ بے طرح ہے مائل بیداد دیکھئے

یہ آگ سب اسی کی لگائی ہوئی تو ہے — خلقت تمام اسی کی ستائی ہوئی تو ہے

جسرت کا حال غیر کوشلیا کا حال غیر

تیرے بغیر سارے اجودھیا کا حال غیر

یوں گرتے اٹھتے بیٹھتے روتے ہوئے تمام — ساعی رہے غریب پئے بازگشت رام

ہر چند اپنے جی کو کیا رام نے کڑا — لیکن وہ تھا ہجوم کہ رتھ روکنا پڑا

ٹھہرا جو رتھ تو دل میں وہ سب ہو کے شاد شاد — کہنے لگی کہ دل کی بر آئی ہے اب مراد

رتھ سے اُتر کے رام جو پیدل رواں ہوئے

پھر لوگ محو گریہ و آہ و فغاں ہوئے

دور اُفق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام — تمسا ندی پہ رام نے آکر کیا قیام

سب کو سلا کے سو گئے ساحل پہ آپ بھی — سوتے ہوئے رہائی کی تجویز سوچ لی

اہل اجودھیا تھکے ماندے تھے سو گئے — قدموں میں آ کے رام کے بے فکر ہو گئے

ازبس کہ دوڑ دھوپ سے دن بھر کی چور تھے — سونا ضرور تھا انہیں غافل ضرور تھے

رگھوبر بہت سے رات رہے اُٹھ کھڑے ہوئے — جس وقت اہل شہر تھے غافل پڑے ہوئے

راہی ہوئے وہ لے کے اجازت سومنت سے — اور ساتھ ہی کہا یہ سومنت سے

لیجاؤ رتھ اودھ کو مگر ہیر پھیر سے — تا اہل شہر کو نہ مرا کچھ پتا ملے

سیتا لکھن سمیت وہ دریا کے پار تھے — تلوے تھے آہ پھول سے اور خار زار تھے

نورجہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہ نورجہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سر مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شب دیجور کا عالم

اے حسن جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمک شب تار وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشق دلگیر کے دل کے

تعویذ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر
یہ دور زمانہ کے الٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر
اے گردش ایام یہ اندھیر یہ اندھیر

ماہ فلک حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ تری ہیچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دل افگار سے کیا کیا
اُٹھتے ہیں شرر آہ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالم تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارا

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ وہ برگ سمن تھے
جو گل رخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے — جو پیکرِ ہستی کے لئے روح رواں تھے
محبوب دل خلق تھے جاں بخش جہاں تھے — تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیر زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دل ناداں — ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں — آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی یہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

برق دہلوی

اچھوتوں سے نفرت

سب کے لئے ہے یکساں قدرت کا فیض جاری
مفلس ہو یا تونگر راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصر کامگاری
دونوں پہ جلوہ گر ہے انوار حضرت باری
ہیں خاک بوس کرنیں مہتاب ضو فشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیل آسماں کی

سیراب سب کو یکسر کرتا ہے آب باراں
تختہ ہو زعفراں کا یا کشت خشک دہقاں
جوش بہار کا ہے یکساں اثر نمایاں
ہو گلبنِ گلستاں یا لالۂ بیاباں
تاثیر فصل سے ہے سود و زیاں برابر
ہیں تحمل دشت و گلشن وقف خزاں برابر

عصیاں شعار ہے یا کوئی مہاتما ہے
خاکی لباس دونوں کو ایک سا ملا ہے
شاہنشہ جہاں ہے یا کوئی بے نوا ہے
جس کو بقا ملی ہے آخر اسے فنا ہے
فطرت کا سب پہ حاوی قانون ایک ہی ہے
عنوان گو جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

پست و بلند کا ہے پھر امتیاز کیسا
ادنیٰ کا رمز کیا ہے اعلیٰ کا راز کیسا
سائے سے بیکسوں کے ہے احتراز کیسا
پتلوں کو خاک کے ہے ہستی پہ ناز کیسا
کیف مئے خودی سے ہے وہم برتری کا
حاصل ہے ورنہ سب کو رتبہ برابری کا

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے　　اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
دور از رہِ حقیقت یہ فرق ظاہری ہے　　ہر قصرِ تن میں روشن اک شمع زندگی ہے
جلوے ہیں سب اُسی کے راز حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیص ذات کیا ہے

مثل حباب کیا ہے لازم ہوا میں بھرنا　　بحر جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہی اترنا
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا　　مُنھ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جو اُن کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا　　ہے وجہ ناز ان کو دورِ کہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا　　بیگانہ ان کو سمجھیں دیوانہ پن ہمارا
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

جوش ملیح آبادی

وطن

اے وطن پاک وطن روح روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن رنگ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار ترا روکش صد روئے نگار

ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پائی غنچوں میں تیرے رنگ کی دنیا ہم نے
تیرے کانٹوں سے لیا درس تمنّا ہم نے
تیرے نظروں سے سنی قرأت دریا ہم نے
تیرے ذرّوں میں پڑھی آیت صحرا ہم نے

کیا سنائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا

تیری ہی گردنِ رنگیں میں ہیں باہیں اپنی
تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی
تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی
کج ہوئیں تیری ہی محفل میں کلاہیں اپنی

بانکپن سیکھ لیا عشق کی افتادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا، وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے بلایا وہ ہَوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چُوما وہ صبا تیری تھی

اوّلیں رقص ہُوا مست گھٹائیں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

اے وطن! آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں — آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں — ہم تو بچپن سے ترے عاشق و سودائی ہیں
بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو — تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو — تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو
خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منہ موڑ کے منہ اپنا دکھائیں گے کہاں — گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاؤنی چھائینگے کہاں؟
بزم اغیار میں آرام یہ پائینگے کہاں؛ — تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائینگے کہاں؟
تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن! جوش ہے پھر قوت ایمانی میں — خوف کیا دل کو سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں — محو ہیں جو تیری کشتی کی نگہبانی میں
غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دینگے — تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دینگے
تجھ کو جیتے ہیں تو غمناک نہ ہونے دینگے — ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دینگے
جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گذر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

جذباتِ فطرت

پہاڑ کی صدا

مری وادی میں ہے پھولوں کی دنیا
اُبلتا ہے مرے پہلو سے چشما
مرے دامن میں ہے شفاف دریا
مری چوٹی پہ قدرت کا تماشا
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

دریا کی صدا

مری لہروں میں تجلی کا خزانہ
مری رَو میں محبت کا فسانہ
مرے دھارے میں عظمت کا ترانہ
مرے گرداب میں چنگ و چغانہ
اِدھر آ، اے مرے شاعر اِدھر آ

طلوعِ سحر کی صدا

مرے آئینہ میں تصویرِ جاناں
مرے دربار میں حوریں غزل خواں
مرے رخسار میں انوارِ ایماں
مرے اوراق میں اسرارِ عرفاں
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

غروبِ آفتاب کی صدا

مری تاریکیوں میں یاس و حرماں
گدازِ دل کے مجھ میں ساز و ساماں
مری سُرخی میں سوزِ برقِ پنہاں
خموشی سے مری سنسان میداں
اِدھر آ۔ اے مرے شاعر اِدھر آ

ستارۂ سحری کی صدا

پجاری ہیں مرے فطرت کے عاشق
مری ضوء وقت نازک کے مطابق
مرا ہلکا سا پَرتو جان مشرق
حسیں مجھ سے جبین صبح صادق
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

شفق کی صدا

مرے عارض میں کندن کی دمک ہے
مری چادر میں کوندے کی لپک ہے
مرے سینے میں عرفاں کی جھلک ہے
مرے آغوش میں تاجِ فلک ہے
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

چاند کی صدا

زمیں و آسماں مجھ سے منوّر
بچھی ہے نور کی ہلکی سی چادر
خنک مجھ سے گل اندا موں کے بستر
مری ضو سے جھلکتا ہے سمندر
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

آفتاب کی صدا

فلک پر دائرہ میرا مزیّن
سحر کے ہاتھ میں سونے کا کنگن
کرن میری نگاہ شوق و پرفن
مرے آتے ہی جاگ اُٹھتے ہیں گلشن
اِدھر اے مرے شاعر اِدھر آ

آدھی رات کی صدا

مرے تاروں کی گردش سازِ عشرت
مری خاموشیوں میں عقل و حکمت
تصوّر دوست کا میری بدولت
قلمرو سے مری خارج ہے محنت
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

فصلِ گل کی صدا

مری محفل میں بلبل کا ترانہ
دلوں کی زندگی میرا فسانہ
ہوائیں میری، خوشبو کا خزانہ
محبت خیز ہے میرا زمانہ
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

سمندر کی صدا

مری موجوں میں مضطر روح طوفاں
مرے سینے میں جوشِ ابرِ باراں
مری تہ میں ہزاروں راز پنہاں
مری تشریح میں ہر عقل حیراں
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

پھول کی صدا

چمن کا حُسن ہوں گلشن کا زیور
مرا عاشق ہے جوشِ رُوح پرور
مری ہر پنکھڑی نرم و معطّر
مرے کانوں میں ہیں شبنم کے گوہر
اِدھر آ اے مرے شاعر اِدھر آ

منہ اندھیرے

مُنہ اندھیرے میں اُٹھا ہوں شعر کہنے کیلئے

تیرگی میں نور کے دریا ہیں بہنے کے لئے

بوئے گل، رنگ اُفق ناز صبا، بانگ ہزار

واہ کیا سامان ہیں بشاش رہنے کے لئے

مُسکراتی آرہی ہے صبح کی مشعل لئے

حُور فطرت مجھ سے اپنے راز کہنے کے لئے

وہ کلی چٹکی، وہ برسا رنگ، وہ پھوٹی کرن۔

ہنس کے وہ انگڑائی لی دریا نے بہنے کے لئے۔

سرور جہان آبادی

موسم بہار کا آخری گلاب

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول
بے کس غریب فرقت احباب میں ملول
اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
دھندلا سا اک چراغ سحر انجمن میں ہے
ہے کوئی غم گسار نہ ہمدم کوئی قریں
رخصت ہوئے چمن سے رفیقان ہم نشیں
بچپن کے آشنا ہیں نہ وہ خانداں کے پھول
بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول
ننھی سی کوئی آہ کلی بھی نہیں قریب
کچھ درد دل کا حال کہے جس سے غم نصیب
ڈالے جو عکس پھول سے رُخ کا غریب پر
جو اس کی آہ سرد کو سن کر ہو نوحہ گر
کملانے دوں گا تجکو میں تنہا نہ شاخ پر
احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے بے خبر

ڈر ہے نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو

جا بھی اور ان کے ساتھ ہم آغوش خواب

کب تک زباں پہ فرقت احباب کا گلہ

ہیں محو خواب مرگ جہاں تیرے آش

اب تیری پٹیوں میں بچھاتا ہوں خاک پر

تجھ کو بھی ان کے ساتھ سلاتا ہوں خاک پ

رخت سفر اٹھاؤں گا میں بھی جہاں سے جلد

چھوٹوں گا مر کے ہجر کے درد نہاں سے جل

احباب مجھ سے جب مرے ہو جائیں گے جدا

تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا

کیا لے کے کوئی آہ کرے عمر جاوداں

یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں

سلک وفا میں جب نہ رہے دُرِّ آب دار

میری بھی بے کسی کا بنے گا وہیں مزار

صفی لکھنوی

الہ آباد

اے الہ آباد اے جولاں گہہ گنگ و جمن　　تیرا دامن تیں تربینی کی ہے اک انجمن
سیکھتے ہیں تجھ سے فرقے میل و ملت کے چلن　　اتحاد باہمی سنگم سے تیرے موجزن

جوشِ ہمدردی سے ہے لبریز پیمانہ ترا
خستہ حالوں کا ہے مے خانہ شفا خانہ ترا

تیرا خسرو باغ اسٹیشن سے تھوڑی دور پر　　دید کے قابل ہیں اُس کے خوش نما دیوار و در
چار دیواری اگر دیکھیں تو آتے ہیں نظر　　مختلف پتھر کے ٹکڑے وصل یوں باہم دگر

جس طرح دلقِ گدائے تارکِ دنیائے زشت
اپنے گھوڑے ہیں چھپائے ساز و سامانِ بہشت

اے زیارت گاہ خلق اے مجمع البحرین ہند　　ماگھ میں میلا ترا مشہور ہے مابین ہند
اکبری قلعہ سرفرازی میں نصب العین ہند　　اور خسرو باغ سے وہ چند زیب و زین ہند

رنگ و بو یا ذائقہ وہ تیرے امرودوں میں ہے
سیب کشمیری سے بازار مردود و دکیں میں ہے

اس نگارستان کا جو نقش تھا وہ دل پذیر　　سیر کرنے منزلوں سے آئے تھے برنا و پیر
صیغہ جات مختلف میں تھی صنائع بے نظیر　　جمع ہر سو خوش نما خیموں میں اک جم غفیر

سب طلسمی کارخانہ تھا یہاں پر کیا نہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضامن الہ آبادی

آرزو

ہے فزوں حد بیاں سے عزّ و شان آرزو
سجدہ گاہ دو جہاں ہے آستان آرزو
دل وہی جس کی عظمت لامکاں سے کم نہیں
اصل میں دیکھو تو بس ہے اک مکان آرزو
دونوں عالم جس کو کہتے ہیں وہ دو ہی چیزیں ہیں
ایک جسم آرزو ہے ایک جاں آرزو
ہاتھ میں کشکول رکھتی ہے فقیروں کے یہی
بادشہ کا سر ہے وقف آستان آرزو
آرزو تخلیق کی پیدا ہوئی اللہ کو
اس سے بڑھ کر کیا دکھائیں تم کو شان آرزو
ظلم ظالم کیا ہے اک خاموش حسرت کا وجود
نالۂ مظلوم کیا ہے اک فغان آرزو
آرزوئیں نیک تھیں یا بد تھیں جانچے گا خدا
اصل میں دنیا ہے دارِ امتحان آرزو
خانۂ دل میں اسی کی روشنی ہے جلوہ گر
آرزو خود ہے ضیا بخش مکان آرزو

دفترِ عالم کا تم اک اک ورق دیکھو بغور
جتنے قصّے ہیں وہ سب ہیں داستانِ آرزو
طور پر موسیٰ کریں دیدارِ خالق کا سوال
ساتھ دے بیٹھی جسارت کا زبانِ آرزو
رام جی کیوں کھینچتے جا کر جنک جی کی کماں
دل میں گر ہوتا نہ تیر بے کمانِ آرزو
بے ستوں اور بازوے فرہاد سے نسبت کجا
عقل میں آتی نہیں تاب و توانِ آرزو
بے طلب سب دل میں آجاتی ہیں وقت دار و گیر
ہمت و جوش و شجاعت میہمانِ آرزو
متحد گر آرزو ہو جائے اہل ملک کی
پھر بہار اپنی دکھائے گلستانِ آرزو
غم نہ کھانا چاہئے پکوان گر پھیکا ملا
یہ سمجھ لو تم کہ اونچی ہے دکانِ آرزو
جبر میں بھی یہ اگر اپنا دکھائیں اختیار
بند راہیں کھول دیں وابستگانِ آرزو
قوتیں مغلوب کر دیں بڑھ کے خود کمزوریاں
توپ کا گولہ بنے تیرِ کمانِ آرزو
کام کی کثرت سے ضامن وقت ملتا ہی نہیں
چند گھنٹوں میں ہو کیا شرحِ بیانِ آرزو

تذکرے اور تبصرے

خواجہ میر درد

تذکرہ درد تخلص۔ خواجہ میر نام زبان اُردو کے اربعہ عناصر میں سے تھے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب ان کے والد تھے۔ اور شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ خاندان کا دلی میں پیری و مریدی کے باعث اعزاز و اکرام تھا۔ علوم رسمیہ سے آگاہ تھے۔ ۱۷۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں کچھ دنوں ملازمت کی تھی لیکن بعد کو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت ہوئے۔ کسی مرید با اعتقاد نے تاریخ کہی۔ ع جیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

تبصرہ ان کا دیوان اُردو مختصر ہے سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے اور کچھ نہیں۔ قصائد و مثنوی وغیرہ۔ کہ عادات شعرا کی ہے۔ انھوں نے نہیں لکھی۔ باوجود اس کے سودا اور میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں ہرگز ان سے کم نہیں۔

تصنیف کا شوق طبیعت میں خداداد تھا۔ علم تصوّف میں بہت سے رسالے اور بڑی بڑی کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ان کی غزل سات شعر تو شعر کی ہوتی ہے۔ مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہتے تھے گویا

تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین
تھے۔ کسی کی ہجو سے سودا کی طرح ان کی زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا
انھوں نے کہا۔ اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے کہ خواجہ
صاحب کا کلام کیا ہے پسی ہوئی بجلیاں ہیں سادگی اور روانی میں ان کی
غزلیں آپ اپنی مثال ہیں۔ بہت سے شعر اور غزلیں ایسی ہیں کہ آج بھی کوئی
لفظ ایسا نہیں جو متروکات کی فہرست میں لکھا جا سکے۔

میر تقی میر

تذکرہ

محمد تقی نام میر تخلص۔ والد کا نام میر محمد علی تھا۔ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوئے
شرفائے اکبر آباد میں سے تھے۔ صوفی منش اور صاحب کشف و کرامت
تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد دہلی گئے اور سراج الدین علی خاں آرزو (جو ان
کے سوتیلے ماموں تھے) کے پاس انھوں نے پرورش پائی میر جعفر علی امروہی سے
فارسی پڑھی۔ فن شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ گنجینہ سخن کی بازی میں آفتاب
ہو کر چمکے قدردانی ایسی ہوئی کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر شہر لے جاتے
تھے۔ دلی کی سلطنت کے زوال پر ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے۔ نواب آصف الدولہ
نے قدردانی کی ۳۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا اور دوسرے امرا بھی عزت کرتے تھے
آخر عمر میں کئی جانگداز صدمے اٹھائے جوان لڑکا۔ جوان لڑکی اور رفیقہ حیات نے
ساتھ چھوڑا۔ میر ان صدموں سے جاں بر نہ ہو سکے اور ۱۸۱۰ء میں فوت ہوئے
واویلا مردشہ شاعراں۔ ناسخ نے تاریخ وفات کہی۔

تبصرہ میر صاحب کی زبان شستہ کلام صاف بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کرتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں نشتر بن جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں دوسرے شعرا کے مقابلہ میں اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔

ابتدائی زمانہ بڑی دشواریوں میں بسر ہوا تھا۔ جب شہرت ہوئی اور امراء و روسا کے ہاں رسائی ہوئی تو دہلی پامال سم اسپاں ہونے لگی۔ جس رئیس نے سہارا دیا۔ وہ مارا گیا یا نکالا گیا۔ طبیعت عاشقانہ تھی اور ایک مرتبہ جنوں کے آثار بھی پائے جانے لگے تھے۔ ان چیزوں نے ان کی غزلوں کو بھی بہت زیادہ متاثر کیا۔ داستان عشق گویا حقیقت نگاری ہوگئی۔ غزلوں کے چھ دیوان یادگار ہیں جن میں تقریباً ۱۷ ہزار اشعار ہیں اتنی تعداد میں کسی دوسرے شاعر کی غزلیں نہیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سا کلام ایسا بھی ہے جو میرؔ کی شایان شان نہیں۔ لیکن جو غزلیں صاف سادہ اور شیریں ہیں اُن میں اب بھی ویسا ہی جذب و کشش ہے جیسا اس زمانہ میں تھا۔ میرؔ کی اُستادی کا سکہ اُردو کے ہر شاعر کے دل پر بیٹھ چکا تھا۔ اور ہر شاعر نے اُن کی پیروی کرنا اپنا فخر سمجھا تھا۔

مرزا محمّد رفیع سودا

تذکرہ مرزا محمد رفیع سوداؔ تخلص ۱۷۱۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش اور تربیت پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقے میں ان کا گھر تھا شاہ حاتم کے شاگرد تھے اور خان آرزو کی صحبت سے فائدے بہت حاصل

کے طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلی جیسے شہر میں اُن کی اُستادی کا شہرہ ہوگیا۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کیلئے دینے لگے۔ دلی کے اکثر اُمرا ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

جب قدردان مر گئے زمانے بدل گئے تو ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں ان کو دلی چھوڑنا پڑا چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ نواب شجاع الدولہ کے مرنے کے بعد اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور نہایت عزت سے اُن کو رکھا۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر ۱۷۸۱ء میں وہیں انتقال کیا۔

تبصرہ سودا۔ اُردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اُردو میں قصائد کا کہنا پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان در عنان ہی نہیں گئے۔ بلکہ اکثر میدان میں آگے نکل گئے ہیں۔ اِن کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔

مرزا کے کلام کے خصوصیات۔ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی و ترتیب کی درستی سے لفظوں کو اس درد

بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طبنچہ کی چاپنیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ خیال نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ تشبیہہ اور استعارے بھی ان کے کلام میں ہیں مگر اتنے جیسا کھانے میں نمک۔ ان کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی نئے نئے خیال اور قافئے جس پہلو سے جمتے دیکھتے جما دیتے تھے۔ جن اشخاص نے زبان اُردو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جو کہیں سے جدا نہیں معلوم ہوتے۔ ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے سجاتے ہیں۔ انھیں کا زور طبع تھا کہ جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پاکر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کر لیا ہے

غزلوں میں کیفیت اور اثر تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن میرؔ کا سوز و گداز اور حسرت ناکی مفقود ہے البتہ اخلاقی مضامین بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں تصوف کے اعلیٰ جذبات نظم ضرور ہوئے ہیں لیکن دردؔ اور میرؔ کا سا امتیاز نہیں حاصل ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

تذکرہ خواجہ حیدر علی نام آتشؔ تخلص۔ آپ دلی کے رہنے والے تھے۔ فیض آباد میں ۱۱۶۱ء میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔

خواجہ زادوں کا خاندان تھا۔ تعلیم خاطر خواہ نہ ہو سکی لیکن شاعری میں وہ نام پیدا کیا کہ سیکڑوں شاگرد پروانوں کیطرح جمع ہو گئے۔ پہلے مصحفی سے تلمذ تھا کسی بات پر ان بن ہو گئی تو اپنی طبیعت پر زور دے کر کہنے لگے۔ ساٹھ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اسی میں گذر اوقات ہوتی تھی۔ رندانہ زندگی بسر کرتے اور قناعت و توکل کا درس دیتے تھے۔ تقریباً نوے برس کے سن میں انتقال ہوا۔ ناسخ سے معرکے رہتے لیکن ناسخ کے مرنے کے بعد شاعری ترک کر دی تھی۔

ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی۔ ع

"خواجہ حیدر علی اے وا مرد ند"

تبصرہ تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول کہنا چاہیئے۔ ایک دیوان غزلوں کا ہے جو کہ ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا۔ دوسرا تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا۔ جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور العمل ہے۔ اور انشا پردازی ہند کا اعلیٰ نمونہ ہے شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا اندازہ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اُسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیئے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی ان کا کلام مضامین بلند سے خالی نہیں۔ طرز بیان صاف ہے سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔

آتش کی نظر میں شاعری مرصع سازی تھی بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں چنانچہ ایسے ہی شعر کہتے اور داد سخن لیتے۔ آتش اور ناسخ دونوں نے

مل کر لکھنؤ دبستان شاعری کی بنیاد رکھی اور دہلی کی پیروی سے آزادی دلائی۔

آتش کے کلام میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کے جلوے بڑی خوبی سے نمایاں ہیں۔ میر اور درد کے بعد تصوف کی شاعری کو از سر نو زندہ کیا۔ مضامین عاشقانہ و رندانہ بھی یک خاص انداز رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں چوٹی۔ کنگھی۔ مسی سرمہ اور انگیا کا ذکر ہے لیکن بہت سے اشعار ایسے فطری انداز میں نظم ہوئے ہیں کہ اپنی آپ مثال ہیں۔ داخلی کیفیت۔ تاثیر۔ اور سوز و گداز کچھ دنوں سے مفقود تھے لیکن آتش کے کلام میں یہ ساری باتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں بھی تصنع۔ تکلف اور آورد کی مثالیں ملتی ہیں لیکن بہت زیادہ بھدی اور بھونڈی نہیں ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ

تذکرہ شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے۔ لیکن والد کے مرنے کے بعد وراثت کے مقدمہ میں چچاؤں نے غلام ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن فیصلہ ناسخ کے حق میں ہوا۔ انہیں سیاسی مصلحت کی بنا پر کئی بار لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ الہ آباد اور دوسرے شہروں میں قیام رہتا تھا۔

فن شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔ اور نظم سخن میں اسکی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا۔ شوق ہمیشہ مشاعرہ میں لے جاکر دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش بڑھاتا تھا۔ اور آسودہ حالی اکثر شعرا اہل فہم اور اہل کمال کو ان کے گھر کھینچ لاتی

ان کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پاتی گئی۔ ۱۸۳۸ء میں انتقال فرمایا۔
میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی۔ ع "دلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے"

تبصرہ تین دیوان ہیں۔ مگر دو مشہور ہیں۔ ان میں غزلوں۔ رباعیوں تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ قصائد کا شوق نہ تھا۔ ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے۔ البتہ ایک آدھ قطعات مدح میں پائے جاتے ہیں۔
عموماً ان کا کلام شاعری کے ظاہری عیوب اور لفظی اسقام سے بہت پاک ہے اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے کہ اگرچہ ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آجائے۔ مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے دیتے غزلوں میں شوکت الفاظ بلند پروازی۔ نازک خیالی بہت ہے۔ شوخی۔ ظرافت تاثر کی کمی ہے۔

اس عہد تک شعرائے لکھنؤ ان استادوں کے شاگرد تھے۔ جو دہلوی تھے۔ لیکن شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی پیروی اور پابندی سے آزاد کر کے زبان دانی کی سند دی اور وہی مستند ہوئی۔

ان کے چند مشہور شاگرد۔ خواجہ وزیر برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر شکوہ آبادی نادر یہ صاحب دیوان اور بجائے خود استاد ہیں۔

ناسخ کے کلام میں الفاظ اور اُن کی سجاوٹ پر زیادہ توجہ پائی جاتی ہے اور خیالات اور جذبات کی حقیقی اور فطری جھلک بہت کم پائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر صنعت نے ان کے کلام میں جگہ پائی ہے۔ شاعری صنعت گری نہیں ہوتی اور نہ شیشہ بازی۔ شاعری انسانی جذبات اور احساسات کا سرچشمہ اور آئینہ ہوتی ہے۔ اس کی بہت کمی ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق

تذکرہ

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوق تخلص۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ ۱۷۸۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول سے ابتدائی تعلیم پائی حافظ صاحب شاعر بھی تھے اور ذوق کی طبیعت شاعرانہ تھی۔ بچپن ہی سے شوق شاعری ہوا تو حافظ صاحب کو غزلیں دکھانے لگے بعد کو شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے مگر کچھ دنوں بعد اُستاد سے ان بن ہو گئی تو خود طبیعت پر زور دے کر شاعری کرنے لگے۔ جب شاہ نصیر دکن گئے تو ذوق بہادر شاہ ظفر کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اور ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ گاؤں جاگیر ملا۔ وظیفہ ماہانہ مقرر ہوا۔ علاوہ ظفر کے مولانا آزاد بھی اُستاد ذوق کے ہونہار شاگرد تھے ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔

تبصرہ

ذوق کی غزلوں کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور خیالات بہت بلند اور رفیع ہیں لیکن جدت طبع کے آثار بہت کم ہیں۔ جدت پسندی غالب اور مومن کا حصہ تھا۔ بہت پرگو تھے اور جلد کہہ لیتے تھے۔ محاورات و ضرب الامثال بہت زیادہ نظم کرتے تھے۔ اخلاقی شاعری کی بھی اچھی مثالیں ان کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ کلام میں زور اور آمد بلا کی ہے شہرت و ناموری ان کو اپنی زندگی ہی میں نصیب ہو چکی تھی۔ غالب اور مومن اتنے زیادہ مشہور نہ تھے جتنے کہ ذوق بہت سا کلام ضائع ہو گیا جو کچھ باقی تھا اُسے آزاد نے بڑے اہتمام سے شائع کرا دیا تھا۔

حکیم مومن خاں مومن

تذکرہ مومن خاں نام مومن تخلص۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں شرفائے دہلی سے تھے اور بڑی عزت رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کے پیدا ہونے کے وقت کان میں اذان دی۔ اور انھیں نے مومن خاں نام رکھا۔ شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کتابیں پڑھیں۔ پھر فن طب جو آبائی پیشہ تھا اس کی طرف توجہ کی اور کمال حاصل کیا علوم نجوم میں ان کو ایسا ملکہ تھا کہ دور دور تک ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے مرشد مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید تھے۔ اور والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ شعر پڑھنے کا انداز نرالا رکھتے۔ کسی امیر کی دربارداری کبھی نہ کی۔ دلی ان کا مولد و مسکن تھا۔ ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔ ظاہری سبب موت کو ٹھے سے گرنا ہوا۔ جس کے بعد بحساب نجوم انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ مہینے یا پانچ برس بعد میں مرجاؤں گا ؎

"دست و بازو بشکست"

تبصرہ ان کے کلیات میں غزلوں کے سوا دو چار قصیدے اور چند مثنویاں اور دو واسوخت بھی ہیں۔ ان کا کلام عشقیہ مضامین کے سوز گداز کا مخزن ہے جس میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

مقطع میں اپنے تخلص کی مناسبت سے اکثر ایسے مضامین لکھے ہیں جو بہت دلچسپ اور موزوں ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

فارس کی قابلیت مسلم تھی اور اس زبان میں بھی ان کا دیوان موجود ہے مومن کی طبیعت میں عاشقانہ کیفیت فطرت سے ودیعت ہوئی تھی چنانچہ واردات عشقیہ ہی وہ نظم کرتے ہیں خواہ وہ غزل ہو یا مثنوی یا قصیدہ۔ ان کے سارے دیوان میں رنگینی عشق کی شوخی۔ بے باکی اور حسرت ناکی پائی جاتی ہے۔ طبیعت جدت پسند تھی۔ چنانچہ مومن کے کلام میں بھی ایسے جواہر پارے ملیں گے جن کی مثال پہلے نہ پائی جاتی تھی۔ بہت سے شعر فارسی تراکیب سے گراں بار ہو گئے ہیں اور بعض اشعار کے معنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے لیکن جب معنی صاف ہو جاتے ہیں تو طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ بعض ایسے شعر بھی ہیں جنھیں ثقہ اور سنجیدہ حضرات پسند نہیں کرتے لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ بہت سے اشعار میں واسوخت کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی جب عشق و محبت کی تکالیف برداشت سے باہر ہوتی ہے تو یہ بھی معشوق کو کٹی جلی سناتے ہیں۔ ان باتوں کے باوجود مومن کے کلام میں ایک طرح کی شگفتگی ایک طرح کی تازگی اور ایک عجیب طرح کا حسن و لطف پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار صف اول کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

تذکرہ آپ کا خاندانی سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے۔ مرزا کی پانچ برس کی عمر تھی کہ ان کے والد عبد اللہ بیگ خاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ لہذا مرزا اپنے چچا کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ ہے کہ مرگ ناگہانی کے وہ بھی شکار ہوئے بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد چھوڑی تھی قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا اس کو اسی ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے مگر سب کھیل بن کر بگڑ گئے۔ دلی کی تباہی کے بعد زیادہ مصیبت پڑی۔ اس وقت رامپور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب رامپور نے سو روپیہ مہینہ مقرر کر دیا مرزا وہاں زیادہ نہ رہ سکے۔ پھر دلّی واپس آئے مگر سو روپیہ ماہوار آخر وقت تک پاتے رہے۔ ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی انتقال ہوا اور درگاہ شاہ نظام الدین اولیا میں مدفون ہوئے۔

تبصرہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی۔ مگر اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ اس زبان کے مسلم الثبوت استاد ہو گئے۔ تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک

انتخابی دیوان ہے کہ ۱۸۴۱ء میں مرتب ہو کر چھپا۔

مرزا غالبؔ اردو کے مایہ ناز اور عدیم المثال شاعر تھے۔ جو کچھ کہا تھوڑا کہا لیکن خوب کہا ہے اور کیا کچھ ان کے چھوٹے سے دیوان میں نہیں۔ قصیدہ ہے تو اس کی شان اور ادا نرالی ہے غزلیں ہیں کہ دلوں میں تیر نیمکش کا لطف اور خلش پائی جاتی ہے۔ جدت پسندی اور انوکھا پن مرزا کی خاص صفت تھی جو اُن کے کلام میں قدم قدم پر نمایاں ہے۔ وہ نظم ہو یا نثر۔ ابتدا میں کلام ذرا مشکل ہوتا تھا جو عام پسند نہیں تھا لیکن احباب کے کہنے اور شاگردوں کے اصرار نے کلام کو آسان کیا اور معنی کو بلند۔ طنز۔ شوخی۔ رنگینی یہ سب اپنی اپنی جگہ پر مرزا کے کلام میں ایک خاص کیفیت کے حامل جو اُن سے پہلے یا بعد کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔

مرزا غالبؔ کی غزلوں میں تصوف اور فلسفہ کا بڑا کافی اور حسین امتزاج ہے اُن کے کلام میں پرانے استادوں کی بھی جھلک ہے اور آنے والے شعرا کے زور طبع کی بھی نشانیاں ہیں یعنی نئے اور پرانے دونوں رنگ کی جھلکیاں ہیں جو اپنی آپ نظیر ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

تذکرہ آپ پانی پت ضلع کرنال کے ایک معزز خاں سے ہیں۔ آپ کے بزرگ ہرات سے آئے اور پانی پت اور اس کے ملحقات مدد معاش کے طور پر شاہی انعام میں ان کو ملے ۱۸۳۷ء کے قریب آپ وہیں

پیدا ہوئے ۔ عنفوان شباب میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی ۔ اس زمانے میں جو کچھ کہا نواب صاحب سے اس میں اصلاح لی ۔ اس تعلق سے آپ کو آزردہ ۔ نیر رخشاں غالب کی خدمات میں باریابی کے اکثر موقع ملتے رہے ۔ کچھ عرصے بعد آپ غالب مرحوم کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے ۔ غالب نے آپ کی طبیعت کا اندازہ کرکے کہا کہ "اگر تم شعر نہ کہو گے تو ظلم کرو گے" مرزا غالب کی وفات پر آپ نے اور مرزا قربان علی بیگ سالک اور میر مہدی حسین مجروح نے مرثیے لکھے ۔ مگر جو مقبولیت آپ کے مرثیے کو ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی ۔

ابتدا میں آپ کی شاعری کا بھی وہی ایشیائی شاعری کا رنگ تھا ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب آپ کو پنجاب بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت ملی ۔ اس وقت مغربی لٹریچر پر غور کرنے کا آپکو بہت اچھا موقع ملا اسی وقت اس راستہ کو ایک قلم ترک کرکے طرز جدید اختیار کیا ۔ کرنل ہالرائڈ صاحب نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کرائی تھی اس میں بجائے مصرع طرح کے خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا ۔ مولانا نے بھی اس گلشن میں جذبات طرازی کے نغمے سنائے چنانچہ نشاط امید مناظرۂ رحم و انصاف ۔ حب وطن ۔ برکھا رت وغیرہ اسی بزم کی یادگار ہیں ۔

تبصرہ مولانا اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد اور ہندوستان کے معجز بیان سعدی ہیں ۔ آپ کا کلام صاف ۔ دلاویز ۔ قومی اصلاح سے بھرا ہوا ہوتا ہے ۔ آپکی نثر کی خصوصیات یہ ہیں کہ الفاظ

اور معنی کی خوبیوں کو برابر لحاظ رکھا ہے۔

فلسفیانہ اور مورخانہ نظر اور لٹریچر کے رموز پر جس قدر واقفیت مولانا حالی کو تھی سر سید مرحوم وہاں تک نہیں پہنچے۔

نثر میں "حیات سعدی" یادگار غالب "حیات جاوید" "مقدمہ شعر و شاعری" اور نظم میں مسدس مدوجزر اسلام، دیوان حالی، شکوۂ ہند اور بہت سی مثنویاں آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ عالیہ نے مولانا کو شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیا جو ان کی علمی خدمات کے اعتبار سے ہر طرح زیبا و مناسب تھا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا۔

حالی جدید شاعری کے رہبر اور امام تھے وہ مبالغہ جھوٹ اور خوشامد سے نفرت کرتے تھے اور نیچرل شاعری اور حقیقت نگاری کے حامی تھے ان کا خیال تھا کہ اردو میں فرسودگی اور پژمردگی جو تقلید و پیروی سے پیدا ہو گئی ہے اسے دور کرنا ہر پڑھے لکھے انسان کا فرض ہے۔ چنانچہ تمام عمر وہ اس بات کی کوشش کرتے رہے اور اس پر عمل پیرا ہوتے رہے۔ اپنے زمانے میں تو انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن آنے والی نسل نے ان کے پیغام کو سراہا اور ان کی باتوں کو احترام کی نظر سے دیکھا۔ قدامت پسند طبقہ انھیں برا بھلا کہتا رہا اور اب بھی جب موقع ملتا ہے تو اپنی تخریبی تنقید سے باز نہیں آتا۔

امیر احمد امیر مینائی

تذکرہ امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ نسب ہونے کی وجہ سے مینائی کہلائے۔ والد کا نام مولوی کرم محمد تھا۔ ۱۸۲۹ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی مشاعرانہ طبیعت پائی تھی کم سنی سے شعر و سخن کی طرف رغبت ہوئی تو اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ کا دربار اور رونق جب ختم ہوئی تو رام پور کا رخ کیا۔ نواب کلب علی خاں نے امیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور قدر افزائی فرمائی چالیس سال تک رام پور میں اطمینان و سکون کی زندگی گذاری اور تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد حیدر آباد گئے اور وہیں ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا۔

تبصرہ امیر مینائی اردو کے متاخرین شعرا میں بڑے ممتاز تھے۔ زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور کوشش اس بات کی ہے کہ اپنا رنگ اور انفرادیت قائم ہو عشق و محبت کے جذبات بہت خوب نظم کرتے تھے۔ نعت گوئی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا ایک دیوان نعت علٰحدہ سے یادگار چھوڑا ہے داغ کی برجستگی۔ بیساختگی تو ان کے کلام میں صرف کہیں کہیں پائی جاتی ہے لیکن عام طور سے کلام بہت صاف اور سادہ ہے کہیں سے ژولیدگی اور الجھاؤ نہیں پایا جاتا۔ شوخی اور رنگینی بہت کم ہے اور اگر

کہیں کوشش کی تو اس میں تکلف اور تکلیف کے آثار پائے جاتے ہیں۔

نواب مرزا خاں داؔغ

تذکرہ نواب مرزا خاں نام۔ داؔغ تخلص نواب شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے جو نواب ضیاء الدین خاں نیّر جاگیر دار لوہارو کے بڑے بھائی تھے ۱۲۴۶ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ غدر کے زمانے تک دہلی میں قلعہ شاہی میں پرورش پاتے رہے۔ تباہی غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے ہاں مقیم رہے۔ پھر خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے عہد قدر افزا میں کاملین شعرا کی جو عزت افزائیاں ہوئیں وہ محتاج بیان نہیں۔ مرزا داغ اس نورتن میں چمکتے رہے۔ قدرداں نواب کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد چمنستانِ سخن کے مرغانِ خوش نوا ایک ایک کر کے آشیاں برباد اور تباہ ہو گئے چنانچہ کہتے ہیں۔

رہے کیا مصطفےٰ آباد میں داؔغ　　وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

رام پور سے جدا ہونے کے کچھ دنوں بعد یعنی ۱۳۰۵ھ میں پہلے پہل حیدر آباد دکن پہنچے۔ اس حاضری میں صرف ایک دفعہ حضور نظام دکن کے سلام کی نوبت آئی۔ ۴ برس تک امیدواری کا زمانہ رہا۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ بضرورت دہلی آنا پڑا۔ بالآخر ۱۳۰۸ھ میں فرمان آصفی نافذ ہوا اور آپ اُستاد السلطان مقرر ہو کر جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک کے خطابوں سے مخاطب و ممتاز ہوئے۔

دربار دکن سے علاوہ عطیات بے شمار ان کی ذات کے لئے ایک ہزار ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اور اسی قدر ان کے اعزہ اور متوسلین پاتے تھے۔ نیز ایک گاؤں بھی عطا ہوا تھا۔ جو آخر وقت تک ان کے قبضہ اور تصرف میں رہا۔ اٹھارہ برس حیدرآباد میں قیام کرنے کے بعد ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو دار فانی سے رحلت کی۔

تبصرہ ان کے مجموعہ کلام میں چار دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہیں۔ آفتاب داغ، گلزار داغ۔ مہتاب داغ۔ یادگار داغ۔ دیوانوں کا اور فریاد داغ مثنوی کا نام ہے۔ اردو زبان کی خدمت شاعری کے ذریعہ سے جیسی مرزا داغ نے کی ہے۔ ایسی کسی نے نہیں کی۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل گوئی ان کے لئے تمغائے امتیاز سمجھی جاتی ہے مگر فی الحقیقۃ ان کی ہمہ گیر طبیعت اور رسائی ذہن ہر رنگ اور ہر روش میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے کلام کا خاص رنگ سہل ممتنع فصاحت روزمرہ کی صفائی شوخی مضمون اور بیان کی ندرت ہے سیکڑوں اشعار لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ زبان کے چٹخارے اور لوچ کے ساتھ بندشیں بہت چست ہوتی ہیں۔ ان کے تمام کلام میں آورد کا نشان نہیں۔ اس وقت ہندوستان میں کوئی معمولی سا معمولی پڑھا لکھا ایسا نہیں جو ان کے نام یا تخلص سے واقف نہ ہو۔ اور ہندوستان کا کوئی شہر یا قصبہ ایسا نہیں جہاں ان کے شاگرد نہ ہوں۔ ان کے شاگردوں میں اقبال سائل نوح ناروی۔ احسن مارہروی۔ اور آغا شاعر دہلوی قابل ذکر ہیں۔ داغ کی بیساختگی اور برجستگی کو ان کے ہمعصروں میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی

تذکرہ اکبر حسین نام۔ اکبر تخلص ۱۸۴۰ء میں موضع بارا ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ جو دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کے والد سید تفضل حسین صاحب تحصیل بارا میں نائب تحصیلدار تھے۔ ابتدا کی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ صرف تین سال تک اسکول میں تعلیم پائی جو کچھ انگریزی جانتے تھے وہ صرف اپنے بل بوتے پر۔ قصبۂ کڑا ضلع الٰہ آباد میں وحید ایک بڑے اچھے شاعر تھے ان سے اکبر نے اپنے کلام پر اصلاح لی شروع میں اکبر صرف بیس روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ ترقی کر کے ججی کے عہدے سے پنشن پائی۔ اور ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا

تبصرہ اکبر کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ان کا ایک خاص رنگ تھا جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ آزادی کے بڑھتے ہوئے جوش میں انہوں نے بدیسی تہذیب کی مخالفت کی و مغربی ممالک کی کورانہ تقلید کو برا جانتے تھے اور راس کا مضحکہ اڑاتے تھے لیکن لب و لہجے میں بڑی متانت اور گہرائی تھی۔ لیکن قدامت پرستی ان کے رگ و ریشے میں اتنی سرائت کر گئی تھی کہ وہ ہر نئی چیز کی ظاہر بظاہر مخالفت کردیا کرتے تھے۔ اسپتال۔ بمبے کا پانی ہوٹل سوٹ بوٹ اس طرح ساری چیزوں کا وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ مضحکہ اڑاتے

ہیں۔ سوشل اور سیاسی معاملات میں بھی وہ بہت زیادہ آگے آگے نہ رہے لیکن انگریزوں کی حکومت پر طنزیہ اشعار کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے وہ دل سے چاہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور یہاں کے لوگ ایک اچھی اور خوش اخلاقی کی زندگی بسر کریں۔

شاد عظیم آبادی

تذکرہ سید محمد علی نام۔ شاد تخلص۔ ۱۸۴۷ء میں عظیم آباد صوبہ بہار میں پیدا ہوئے فارسی عربی کی کامل استعداد بہم پہنچائی۔ لڑکپن سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے مختلف استادوں سے اصلاح لیتے تھے بعد کو شاہ الفت حسین فریاد سے تلمذ حاصل کیا۔ حالی آزاد اور اسمٰعیل کے ہم عصر تھے

تبصرہ شاد کی غزلوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ شاد کی طبیعت ہمہ گیر تھی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل قصیدہ مرثیہ رباعی قطعات و نظم لطیف زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور بڑے پر گو تھے تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے ہوں گے۔ روزمرہ اور محاورات بڑی خوبی سے نظم کرتے تھے۔ صوبہ بہار کو ان کی اردو دانی پر ناز ہے کہ ٹکسال باہر ہوتے ہوئے بھی ایسے ایسے اشعار کہے ہیں کہ اہل زبان کیا کہیں گے۔ کلام قدیم رنگ کا ضرور ہے لیکن طبیعت جدت پسند تھی اس لئے بڑے نازک۔ لطیف اور آبدار شعر بھی ڈھالے ہیں جن کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔

حسرت موہانی

تذکرہ فضل الحسن نام۔ حسرت تخلص ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے ۱۹۰۳ء میں علیگڈھ سے بی۔اے پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے سے اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق تھا۔ آپ امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ آپ نے ایک ادبی رسالہ اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع کیا تھا۔ جس میں شعرائے متقدمین کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا کرتے تھے آپ کے آٹھ دیوان شائع ہو چکے ہیں۔

تبصرہ حسرت کی غزلوں کی زبان صاف ہے طرز ادا میں جدت ہے بیان میں شوخی اور ندرت ہے۔ قدما کی غزلوں میں جو معائب ہیں وہ ان میں نہیں ہیں۔ فواحشات سے آپ کا کلام پاک ہے۔ آپ کا شمار اس وقت بہترین شعرا میں سے ہے۔ غزلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں حسرت کا بہت بڑا حصہ ہے اسی لئے بعض حضرات انھیں غزل گویوں کے امام کہتے ہیں۔ بعض شعرا کی بے راہ روی سے غزلوں میں بڑی افسردگی اور فرسودگی پائی جانے لگی تھی حسرت نے اس پودے کو پھر سے سینچا اور ہرا بھرا کیا۔ حسرت نے غزلوں کے سانچے سے بہت کچھ کام لیا ہے۔ وہ اسی کے ذریعہ سوسائٹی کے اصلاح بھی چاہتے ہیں۔ آزادی کے نغمے بھی اس سے انھوں نے سنائے ہیں اور انگریزوں کے خلاف آواز بھی بلند

کی ہے۔ غزلوں کی جامعیت اور رنگارنگی کو پورے طور پر ثابت کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں حقیقی اور مجازی عشق دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں عشق مجازی میں بھی صحت وری کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

فانی بدایونی

تذکرہ شوکت علی نام۔ فانیؔ تخلص ۱۸۷۹ء میں بمقام بدایوں پیدا ہوئے آبا و اجداد کابل کے رہنے والے تھے عہد مغلیہ میں بدایوں کے گورنر ہو کر آئے تھے۔ غدر کے بعد ساری جائداد ضبط ہو گئی اور ان کے والد ملازمت کرنے لگے ابتدائی تعلیم انٹرنس تک بدایوں میں ہوئی اس کے بعد بریلی کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ وکالت پڑھنے کیلئے علی گڑھ گئے۔ طبیعت شاعرانہ لے کر آئے تھے اس لئے وکالت سے انھیں کوئی مناسبت نہ تھی صرف اپنے والد کے اصرار سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ بہت کوشش کی لیکن وکالت نہ چلنی تھی نہ چلی۔ چنانچہ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں ملازمت کر لی وہاں بھی اطمینان و سکون حاصل نہ ہوا اور پریشانیوں میں مبتلا رہے ۱۹۴۱ء میں بمقام حیدرآباد انتقال ہوا اور وہیں پر دفن ہوئے اپنے مرنے کا احساس انھیں کچھ دنوں پہلے ہو چکا تھا۔ پہلے شوکت تخلص کہتے تھے لیکن بعد کو فانی اختیار کیا اور اسی تخلص سے مشہور ہوئے۔ کلیات فانی جو حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے وہ درحقیقت انکا سارا کلام نہیں ہے بلکہ بہت سا ضائع بھی ہو چکا ہے۔

تبصرہ فانی غم انگیزی اور حسرت ناکی مضامین بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور بعض شعروں پر میر تقی میر کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ ندرت بیانی انھوں نے غالب سے پائی ہے۔ لیکن ویسی لطافت۔ پاکیزگی۔ شوخی اور رنگینی ان کو نہیں ملی ہے۔ نہ میر اور غالب کی سی ہمگیری اور جامعیت ہے۔ البتہ درد سوز گداز اور اثر بہت کافی پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کبھی بھی ناپید اور مٹنے والی نہیں ہوتی تھی اور کم سے کم آیندہ زندگی مرنے کے بعد تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے اس کو کبھی بھی فنا نہیں ہے۔ عشق و محبت کی زندگی وہ انسانیت کا جوہر سمجھتے ہیں اور ایسی ہی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

جگر مرادآبادی

تذکرہ علی سکندر نام جگر تخلص۔ وطن مرادآباد ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے اصلی وطن آپ کا دلّی تھا۔ لیکن آپکے مورث دلی چھوڑ کر مرادآباد چلے آئے تھے۔ جگر کے والد مولوی علی نذر صاحب بھی شاعر تھے تعلیم و تربیت بہت معمولی ہے فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں انگریزی سے تھوڑی بہت واقفیت ہے۔ پہلے چشموں کی تجارت کرتے تھے۔ اور اب مستقل پیشہ شاعری ہے۔ آج کل گونڈے میں مقیم ہیں اور وہیں سے سارے ہندوستان کا دورہ کیا کرتے ہیں۔

تبصرہ۔ جگر صاحب کی غزلیں ایک خاص کیفیت اور والہانہ انداز

رکھتی ہیں کہ جس کی وجہ سے جگر کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ وہ پڑھتے بھی مخصوص انداز سے ہیں کہ سارا مجمع ہمہ تن ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ دل ان کا لذت عشق سے آشنا ہے اور جرأت ان کی رندانہ پہلے شراب بھی پیتے تھے اب بالکل ترک کر دی۔ شعلۂ طور ان کے غزلوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جو اپنی سادگی روانی اور صفائی کی وجہ سے بہت مقبول ہوا ہے۔ نئی نئی فارسی ترکیبیں اور نازک و لطیف تشبیہ و استعارے ان کے کلام کے اصلی زیور ہیں۔ بے ساختگی اور برجستگی ان کے اشعار کی جان ہے۔ اجتماع ضدین اور لفظوں کی بار بار تکرار اور الٹ پھیر سے بھی وہ کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس سے ان کے کلام میں جدت پسندی کی جھلک پائی جانے لگتی ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست

تذکرہ ۱۸۸۵ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر چند ہی سال کے بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں تعلیم پائی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۱۲ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں رائے بریلی گئے تھے۔ وہاں سے واپسی کے وقت اسٹیشن پر بیٹھے تھے کہ یکایک فالج کا حملہ ہوا زبان بند ہو گئی۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا۔ آپ کی لاش لکھنؤ لائی گئی اور یہیں اُن کے سب آخری مراسم ادا کئے گئے

تبصرہ | آپ کی غزل میں آتش اور مسدس میں انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ آپ کا کلام صفائی اور سادگی سے خالی نہیں مگر خیال کی بلند پروازی اور شوکت الفاظ بہت زیادہ ہے۔ آپ کے کلام میں قدرتی مناظر کے سین مختلف جذبات کی مصوری حب وطن ادب اخلاق کی دلفریب تصویریں بکثرت دکھائی دیتی ہیں۔ واقعات کے نظم کرنے میں آپکی قابلیت قابل داد ہے۔

آپ کا خیال تھا کہ محض نئے خیالات کا نظم کر دینا شاعری نہیں ہے آپ کی کوشش تھی کہ نئے خیالات ضرور نظم کئے جائیں مگر زبان اور اسلوب بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا جوہر نہ جاتا رہے کیونکہ زبان میں الفاظ کی بندش سے صناعی کرنا شاعری کا جزو اعظم ہے اس خیال کا اثر آپ کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہے۔

میر ببر علی انیس

تذکرہ | میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ ۱۸۰۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے اور میر حسن دہلوی کے پوتے تھے لکھنؤ میں تربیت پائی اور ضروریات فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۷۴ء میں بمقام لکھنؤ انتقال ہوا۔

تبصرہ | ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں پسندیدہ تھی حسن بیان۔ لطف محاورہ۔ کلام کی صفائی اس درجہ ہے کہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ انھوں نے ایجاد مضامین کے

دریا بہادئے ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا
ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا
عالم دیکھو سبحان اللہ۔ رات کی رخصت۔ سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا
طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شامِ غریباں کی اُداسی کبھی رات کا سناٹا کبھی
تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ برنگ سے دکھانا
غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں باندھ دیا ہے۔

میر انیس نے اردو مرثیوں کو معراج کمال پر پہنچا دیا ورنہ پہلے لوگ کہا کرتے
تھے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوا کرتا ہے۔ میر انیس نے یہ ثابت کر دیا کہ فن مرثیہ
گوئی بڑا مشکل فن ہے۔ ہر شاعر اس میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مرثئے
پڑھنے بھی خاص انداز سے تھے کہ سارا مجمع محو حیرت ہو جاتا تھا۔ میر انیس کا مشاہدہ
نفسیاتی تحلیل سیرت نگاری اور واقعہ نگاری ایسی ہے کہ دنیا کے بہترین شاعر
کے مقابلہ میں ان کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں مقامی رنگ بھی
بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام ایسا ہوتا ہے کہ غیر مذہب والے بھی لطف
اندوز ہوتے ہیں اور دادِ سخن دیتے ہیں رزمیہ شاعری کی اردو میں بہت کمی تھی
میر انیس نے اس کمی کو پورا کیا۔ انسانی جذبات و احساسات کی تصویر کشی ایسی کی
ہے کہ دوسرے اس منزل تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔

مرزا سلامت علی دبیر

تذکرہ مرزا سلامت علی نام۔ دبیر تخلص۔ مرزا غلام حسین کے صاحبزادے
تھے ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے خاندانی شاعر نہ تھے۔ لڑکپن میں مرثیہ

پڑھتے تھے اس شوق نے مرثیہ گوئی کی طرف مائل کیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے۔ اور جو کچھ استاد سے پایا اُسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا طبیعت ایسی گداز پائی تھی جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ ان کی سلامت ردی پرہیز گاری اور مسافر نوازی سخاوت نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دیا تھا۔ شوکت الفاظ مضامین کی آمد۔ جابجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ الم ناک اور دل گداز انداز جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ ان وصفوں کے ... ماہ ہیں۔ ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

تبصرہ مرزا صاحب بڑے پر گو تھے ہزاروں مرثئے اردو میں نظم کئے اور بڑی شہرت پائی۔ باوجودیکہ زبان مشکل استعمال کرتے تھے انکے مرثئے بہت زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات بلاغت اور معنی آفرینی کہی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلام میں آورد بہت زیادہ ہے البتہ شہادت اور بین بہت اچھا نظم کرتے تھے۔ حضرت علی اصغر کی شہادت بہت خوب کہی ہے اس میں فطرت نگاری کی ساری خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

شبلی نعمانی

تبصرہ شبلی نعمانی زیادہ تر قطعات نظم کیا کرتے تھے ان کے کلام میں ایک آدھ شخصی مرثیہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو کچھ کہا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن بعض قطعات اور نظمیں اپنے شاعرانہ محاسن کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔ بہت سی نظمیں علی گڈھ کالج کی اصلاح میں لکھی ہیں اور بعض نظمیں مسلم لیگ کے نظریوں کی مخالفت میں پائی جاتی

ہیں وہ آزادی کے خواہاں تھے اور ہمیشہ اسی کی تائید کرتے رہے مسلم لیگ کے رویہ کے مخالف تھے جس کا اعلان بہانگ دہل کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حریت کی تعلیم دیتے ہیں۔

منیرؔ شکوہ آبادی

تذکرہ سید اسمٰعیل حسین نام۔ منیرؔ تخلص۔ شکوہ آباد ضلع مین پوری کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۳ء میں بمقام شکوہ آباد پیدا ہوئے لیکن زیادہ تر لکھنؤ میں قیام رہتا تھا۔ ناسخؔ کے شاگرد ہوئے بعد کو میر علی اوسط رشکؔ کو کلام دکھانے لگے۔ مرثیہ میں مرزا دبیرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں انتقال ہوا۔ غدر کے بعد ایک مقدمہ قتل میں ماخوذ ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کالے پانی کی سزا ملی تھی لیکن بعد کو بری ہو گئے۔

تبصرہ متاخرین میں منیرؔ شکوہ آبادی بڑے ممتاز شاعروں میں سے تھے امیرؔ اور داغؔ سے مقابلہ رہتا تھا۔ بڑے قادر الکلام تھے۔ غزل قصیدہ۔ مثنوی اور مرثیئے ان سے یادگار ہیں۔ کلام میں بنوٹ اور استعاروں کی کثرت ہے جس سے کلام بے نمک ہے کہیں کہیں منظر نگاری کی بھی مثالیں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بہت کامیابی حاصل کی ہے۔ پر گوئی اور زود گوئی کی وجہ سے کلام میں غلطیاں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن لطف اور اثر کی کمی پائی جاتی ہے۔ جو اشعار صاف ہیں اُن میں تاثیر بھی ہے اور کیفیت بھی۔ محاورات و ضرب الامثال کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحات علمیہ کے نظم کرنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

میر حسن دہلوی

تذکرہ میر غلام حسن نام۔ حسن تخلص۔ میر ضاحک کے بیٹے اور میر انیس کے دادا تھے ۱۷۳۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے درسی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں اور کلام پر اصلاح بھی ابتدا میں اُنھیں سے لی۔ کچھ دنوں کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ساتھ فیض آباد گئے ۱۷۷۵ء میں پھر لکھنؤ واپس آئے ماہ محرم ۱۷۸۹ء میں ۵۲ برس کی عمر میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

تبصرہ آپ کی عربی تعلیم کم تھی۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ آپ کا کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے غزل رباعی مثنوی مرثیہ خوب کہتے تھے البتہ قصیدے زوردار نہ ہوتے تھے۔ مثنوی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آپ کی مثنوی سحر البیان بہت مشہور ہے۔ جس کا اب تک کوئی جواب نہیں ہوا آپ سے ایک تذکرہ شعرائے اردو کا ایک دیوان غزلوں کا اور گیارہ مثنویاں یادگار ہیں۔ تمام مثنویوں میں سحر البیان کو شہرت زیادہ ہے۔ اس کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے۔ اس مثنوی کا قصہ خود میر حسن نے لکھا تھا۔ مثنوی بعض خصوصیات کی وجہ سے بڑی قابل قدر ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک دلچسپی باقی رہتی ہے۔ میر حسن کا مشاہدہ بہت گہرا تھا اس زمانے کی معاشرت اور طرز زندگی جو امیروں کی تھی اس کی عکاسی باحسن وجوہ ہوئی سیرت نگاری کے فرائض بھی بخوبی انجام دئے ہیں۔ موقع اور محل کی مناسبت سے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ افسانوں کے لئے جو طرز مرغوب ہوتی ہے وہی

اس مثنوی کا انداز بیان ہے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم

تذکرہ آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مصنف ہیں ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے ۱۸۴۳ء میں ۳۲ سال کی عمر میں انتقال کیا فارسی میں کافی استعداد رکھتے تھے۔ امجد علی شاہ اودھ کے فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے شعر وسخن کا شوق بچپن ہی سے تھا ۱۷ سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔

تبصرہ نسیم نے یوں تو غزلوں کا دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے لیکن ان کی غزلوں کا کوئی خاص امتیازی رنگ نہیں ہے اس میں ویسی ہی غزلیں ہیں جیسی لکھنؤ والے کہتے تھے۔ البتہ صفائی اور سادگی کچھ زیادہ ہے۔ نسیم کی شہرت کا دار ومدار ان کی مثنوی گلزار نسیم ہے جسے انھوں نے کم سنی میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کہا تھا۔ بعض نکتہ چینوں نے اعتراضاً یہ مشہور کر دیا تھا کہ یہ مثنوی آتش نے کہہ کر دی تھی لیکن یہ الزام بے بنیاد ہے۔ شاعرانہ جوہر فطری ہوا کرتے ہیں اور نسیم میں یہ پائے جاتے تھے۔ اس مثنوی کا حسن یہ ہے کہ بہت طولانی قصہ کو مختصر لفظوں میں نظم کا جامہ پہنا دیا جو لطف سے خالی نہیں ہے۔

آزاد

تبصرہ آزاد نے نئی شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور کوشش کی کہ شعرائے اردو قدیم روش سے ہٹ کر نئے قسم کی نظمیں لکھیں۔ خود بھی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور مثنویاں لکھی تھیں جنھیں پہلی کوشش سمجھنا چاہیئے۔ منظر نگاری اور تاریخی نظمیں بھی خوب کہتے تھے۔ کلام میں شگفتگی لطافت اور رنگینی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تمثیلی رنگ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ زبان میں لوچ اور صفائی ویسی ہی ہے جیسے کہ ذوق کے کلام میں پائی جاتی ہے بعضوں کا خیال ہے کہ فکر و نظر بہت بلند اور عمیق نہ تھی سامنے کی باتیں نظم کر دیا کرتے تھے۔ بہر حال یہی کیا کم حسن ہے طبیعت چونکہ نثر کی طرف زیادہ مائل تھی اس لئے شعر و سخن کی دیوی کی بہت زیادہ پرستاری نہ کر سکے۔ اگر توجہ کرتے تو شاید کامیاب ہوتے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

تذکرہ ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ وطن الوف آپ کا سیالکوٹ ہے لاہور کالج میں تعلیم پا کر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ابتدائے سن تمیز سے طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ فن سخن کا صحیح مذاق سخن آفریں نے آپ کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں آپ نے نالۂ یتیم کے عنوان سے ایک قابل قدر نظم پڑھی یہ نظم دلگداز اور موثر ہونے کی وجہ سے کچھ ایسی مقبول

خاص وعام ہوئی کہ یتیم خانہ کے لئے چندے کی بارش ہونے لگی۔ اسی نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی جو اب اطراف ہند میں پھیلی ہوئی ہے
گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں پروفیسر رہے۔ کچھ دنوں کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری لائے اور وکالت بھی پاس کی۔ کچھ دنوں تک پروفیسری کی بعد کو سیاسی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں سر کا خطاب ملا۔ گول میز کانفرنس کے ممبر ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔

تبصرہ | اقبالؔ ان معدودے چند شعرا میں سے تھے جنھیں شہرت و قبول عام کی سند ان کی زندگی ہی میں مل گئی تھی وہ رسمی شاعر نہ تھے بلکہ اپنے سامنے ایک خاص غرض و مقصد رکھتے تھے۔ وہ شاعر فلسفی اور رہبر ہونے کا دم بھرتے تھے اور سوسائٹی کی اصلاح اپنا فرض جانتے تھے۔ ان کی شاعری میں قومیت کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ گرے پڑے لوگوں کی حمایت کر لیتے تھے۔ فرنگی راج کی مخالفت اور مغربی تہذیب کی برائی کرتے تھے۔ زیادہ تر نظمیں ایسی اصلاحی ہیں اور بعض نظمیں حب الوطنی کی تعلیم دیتی ہیں۔ بعض نظمیں مسلمانوں کی زبوں حالی کا مرثیہ ہیں۔ انھوں نے خودداری۔ خود اعتمادی اور عمل پیہم و جدوجہد مسلسل کی تعلیم دی کہ اسکے ذریعہ غلامی کی زنجیریں توڑی جا سکتی ہیں۔

اقبال کی نظموں کی زبان بہت زیادہ فارسی آمیز ہے لیکن دوسرے مجموعہ بال جبریل کی بعض نظمیں بہت صاف سادہ اور شیریں ہیں اور ہندی کے الفاظ بھی بڑی خوبی سے نظم ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ سے زیادہ

خیال پر زور دیتے تھے۔ شاعری کو الفاظ کے گورکھ دھندے تک محدود نہیں
رکھتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر

تبصرہ محمد علی جوہر علاوہ انگریزی کے ادیب اور عالم ہونے کے اردو
کے بڑے بے مثل شاعر تھے۔ داغ کے شاگرد تھے لیکن شاعری
میں ان کے کلام میں داغ کی خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ سیاسی لیڈر ہونے کی
وجہ سے سارا وقت اُن کا تحریک آزادی میں صرف ہوتا تھا۔ فرصت کے
اوقات میں تفریح طبع کیلئے شاعری کا مشغلہ رہتا تھا۔ اس میں بھی غور و فکر کی علامتیں
پائی جاتی ہیں۔ جو شعر کہتے ہیں کیفیت اور اثر سے لبریز رہتا ہے انگریزوں کے
خلاف آواز بلند کرنے میں وہ شاعری کو بھی ذریعہ بناتے تھے۔ دہلی اور
دوسرے مقاموں پر جو مظالم پولیس اور فوج والے کرتے تھے اُنھیں یہ شعر
میں نظم کر دیتے تھے جس سے نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ غزلیں بھی کہی
ہیں لیکن جنسی تعلقات کا ذکر بہت کم ہے۔ اخلاقی حیثیت سے ان کی
غزلیں بھی بڑی قابل قدر رہیں۔

تلوک چند محروم

تذکرہ تلوک چند نام محروم تخلص۔ عیسیٰ خیل ضلع میاں والی پنجاب
کے رہنے والے ہیں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے والد کا نام
بھگت رام دیال ہے آبائی پیشہ کاشتکاری اور زمینداری تھا لیکن بٹوارے

کے بعد سے دہلی میں مقیم ہیں۔

تبصرہ تلوک چند محروم مختصر نظمیں جن سے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر بڑا اثر پڑے بہت خوب کہتے ہیں۔ بیانیہ شاعری میں انکو یدِطولیٰ حاصل ہے اور واقعہ نگاری بھی اچھی کرتے ہیں۔ موصوف کا کلام اردو کے مستند رسالوں میں کافی شائع ہو چکا ہے اور خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ درسی کتابوں میں بھی ان کی نظمیں پسند کی جا چکی ہیں۔ نظموں کا مجموعہ بھی الگ شائع ہو چکا ہے۔ جو بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی

تذکرہ شبیر حسن خاں نام اور جوشؔ تخلص ۱۸۹۴ء میں بمقام ملیح آباد پیدا ہوئے فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں۔ والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لئے تعلیم و تربیت خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ لیکن پھر بھی اردو۔ فارسی اور انگریزی کا بڑا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے حیدر آباد چلے گئے اور دار الترجمہ جامع عثمانیہ میں ملازمت کر لی لیکن وہاں کے جاگیر دارانہ فضا ان کی طبیعت کو راس نہ آئی۔ اور چلے آئے دہلی سے رسالہ کلیم جاری کیا لیکن تھوڑے دنوں کے بعد بند کر دیا بعد میں لکھنؤ سے نیا ادب جاری کیا اور پھر بمبئی کے فلمنگ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اب گورنمنٹ آف انڈیا میں رسالہ آج کل کے اڈیٹر ہیں۔

تبصرہ جوشؔ کی طبیعت ہمہ گیر اور جامعیت پسند ہے ہر قسم و سخن طبع آزمائی کر چکے ہیں اور قدیم و جدید رنگ دونوں پر

قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن شہرت و ناموری نئے خیال کی نئی نظموں سے ہوئی وہ شاعر انقلاب ہیں وطن کی محبت ان کے دل میں موجزن ہے حب الوطنی اور جوش قومی کی ترغیب دیتے ہیں۔ بڑی اچھی فطرت نگاری کرتے ہیں اور مذہب کی بری رسموں کی بھی اصلاح چاہتے ہیں۔ یہی نہیں وہ خدا کو جبار و قہار جانتے ہیں اور انسان کو مجبور محض۔ دیہاتی سماج کو بہتر بنانا انھوں نے اپنا فرض سمجھا ہے اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرنا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص حسن پایا جاتا ہے۔ وہ مضمون و خیال کو بڑے تسلسل کے ساتھ غزلوں میں نظم کرتے ہیں لیکن ایسی غزلیں ابھی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ طبیعت کا رجحان زیادہ تر اشتراکیت کی طرف ہے لیکن ہندوستان کی محبت سے ان کا دل لبریز ہے اور وہ اسے خوشحال اور آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے دور حکومت میں بھی انھوں نے آزادی انقلاب کا نعرہ بلند کیا اور اب بھی وہ خاموش نہیں ہیں۔

منشی درگا سہائے سرور

تذکرہ منشی درگا سہائے نام سرور تخلص۔ والد کا نام حکیم پیارے لال تھا ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد ضلع پیلی بھیت پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم تحصیل کے اسکول میں ہوئی۔ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد فارسی پڑھنی شروع کی اور شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ اور انگریزی پرائیویٹ طور پر پڑھ کر انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ابتدا میں وحشت تخلص تھا بعد کو سرور اختیار کیا۔ ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔

تبصرہ سرور جہان آبادی غزلیں بھی کہتے تھے لیکن شہرت نظموں کی وجہ سے ہوئی۔ نظموں میں ایک خاص کیفیت اور شیرینی پائی جاتی ہے جو انہیں نظم گویوں میں ممتاز کرتی ہے ان کی نظموں میں مقامی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اور فطرت نگاری بڑی خوش اسلوبی سے ہوئی ہے۔ صرف منظر کشی نہیں کرتے بلکہ فلسفیانہ اور گہری نظر سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھولوں۔ پیڑوں اور چڑیوں کی زندگی سے درس حکمت دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں ایسی ہیں جن سے نوجوان اور لڑکے لڑکیاں بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ زبان البتہ ذرا اونچی ہوتی ہے فارسی تشبیہہ اور استعارات کافی ہوتے ہیں۔

صفی لکھنوی

تذکرہ علی نقی نام اور صفی تخلص رکھتے تھے۔ دراصل دہلی کے باشندے تھے۔ لیکن آپ کے دادا فیض آباد چلے آئے۔ اور فیض آباد سے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۱۸۶۲ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی اچھی خاصی تعلیم پائی تھی اور تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتے تھے محکمۂ دیوانی میں ملازم تھے۔ ۴۰ سال تک ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں بمقام لکھنؤ انتقال ہوا۔

تبصرہ مولانا صفی بڑے قادر الکلام شاعر تھے ہر قسم سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزلوں کی وجہ سے شہرت پائی۔

عاشقانہ مضامین بڑی صفائی اور بڑے حُسن کے ساتھ نظم کرتے تھے۔ کلام برجستگی کی وجہ سے سامعین پر بڑا کافی اثر ہوتا تھا۔ انھیں مصلح غزل کہنا بہت مناسب ہوگا۔ لکھنؤ کے بعض شعرا کی وجہ سے غزل میں جو افسردگی، پژمردگی اور بے رنگی پائی جانے لگی تھی اُسے مولانا صفی نے دور کرنے کی کوشش کی۔ خارجی اثرات مثلاً کنگھی، چوٹی، سرمہ۔ مسّی وغیرہ کے مضامین سے اپنے کلام کو پاک کیا صفی صاحب نے نظمیں بھی لکھی ہیں جو وہ شیعہ کانفرنس کے جلسوں میں پڑھا کرتے تھے لیکن یہ نظمیں تعصب کے بدنما داغ سے بری ہیں۔

ضامن

تذکرہ سید محمد ضامن علی نام اور ضامن تخلص سنہ ۱۸۹۴ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع راے بریلی میں پیدا ہوئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی یہاں عرصے تک آپ کا قیام رہا۔ ایف۔ اے کا امتحان آگرہ سے پاس کیا اور بی۔ اے، ایم۔ اے کی ڈگریاں الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ بی۔ اے پاس ہوتے ہی ہائی کورٹ میں مترجم اور اس کے کچھ دنوں کے بعد کرشچین کالج میں پروفیسری کرلی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں بحیثیت لکچرار مقرر ہوئے سنہ ۱۹۲۴ء میں جب اردو ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا تو ضامن صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے۔ عہدوں میں برابر ترقیاں ہوتی رہیں اب وہ اردو کے پروفیسر اور صدر ہیں۔ آپ نے فوجی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ جن کے صلے میں تمام عمر کے لئے کپتان مقرر ہوئے

ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ آپ کی فوجی اور ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے ایم۔ بی۔ ای کا خطاب عطا کیا ہے۔

تبصرہ ضامن صاحب کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے بچپن ہی سے شعر وسخن کی طرف رغبت رہی ہے۔ میر علی عباد صاحب بنیساں جو موصوف کے ماموں تھے وہ منیر شکوہ آبادی کے خاص شاگرد تھے انھیں سے ضامن صاحب کا تلمذ رہا ہے۔ طبیعت ہمہ گیر ہونے کی وجہ سے ہر قسم وسخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں قصیدے نظمیں اردو کے مشہور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور ریڈیو پر بھی پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔ ابتدائی غزلوں میں ناسخ کا رنگ تو ضرور جھلکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن بعد کی غزلیں بہت صاف اور پُر اثر ہیں۔ پاکیزہ جذبات اور نازک خیالات آپ کی غزلوں میں نظم ہوا کرتے ہیں۔ قطعات بہت خوب کہتے ہیں اور تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ تین دیوان کمل ہو چکے ہیں۔ مشق سخن کی وجہ سے زود گوئی حاصل ہوگئی ہے۔ وقت اور موقع پر بہت تھوڑے وقت میں غزلیں اور نظمیں کہہ لیتے ہیں۔ شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے پروفیسروں میں ان کا شاعرانہ خیال ایک خاص امتیازی درجہ رکھتا ہے۔

مرزا یگانہ

تذکرہ مرزا واحد حسین نام۔ پہلے یاس تخلص تھا بعد کو یگانہ تخلص کرنے لگے۔ ۱۳۰۱ھ میں مرزا صاحب عظیم آباد صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہار ہی میں ہوئی۔ شاعری سے فطری تعلق تھا

پہلے بیتاب سے اصلاح سخن لیتے تھے بعد کو شاد عظیم آبادی سے مشورہ کرنے لگے جس کی وجہ سے مشق سخن بھی ہوئی اور کلام میں پختگی بھی آئی ۱۹۰۴ء میں کلکتہ میں بیمار پڑے اور علاج کرنے لکھنؤ آئے اور یہیں جائے سکونت اختیار کرلی۔ کچھ دنوں کے بعد حیدرآباد میں نائب رجسٹرار مقرر ہوگئے۔

تبصرہ مرزا صاحب کو ہر صنف سخن پر قدرت حاصل ہے۔ غزلیں بھی خوب کہتے ہیں۔ لیکن رباعیوں میں ان کے جوہر زیادہ نمایاں ہوئے۔ رباعیوں میں اخلاقی سماجی اور عشقیہ مضامین نظم کرتے ہیں۔ زبان اور بیان کے لحاظ سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہندی کے شیریں الفاظ کو بڑی خوبی سے یہ رباعیوں میں نظم کرتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ "ترانہ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے